بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفصیلاتِ کتاب

جملہ حقوقِ طباعت بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	موضوعاتی درسِ قرآن سورۂ رحمٰن
زیرِ سرپرستی	:	پیرِ طریقت رہبر شریعت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب دامت برکاتہم
افادات	:	مفسرِ قرآن فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی شاہ محمد نوال الرحمن صاحب دامت برکاتہم
ناشر	:	شریعہ بورڈ آف انڈیا (حیدرآباد)
تعداد	:	۱۰۰۰
صفحات	:	۲۰۶
سن طباعت	:	ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ، مطابق فروری ۲۰۱۵ء
قیمت	:	۱۸۰

ملنے کے پتے

آستانۂ صوفی یوسف نگر ٹپہ چبوترہ حیدرآباد، فون نمبر: 8341175786/9989478786

شریعہ بورڈ آف انڈیا، موتی گلی خلوت، حیدرآباد، 24512525 - 040

مکتبہ کلیمیہ نامپلی، یوسفین چوراہا۔ 09885655591

ادارۂ دعوت و تبلیغ روبرو جامع مسجد ملے پلی، حیدرآباد۔

ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان حیدرآباد۔

دکن ٹریڈرس، چارمینار، حیدرآباد۔

Rahmat-e-Alam Foundation
7045 Western Avenue, Chicago, IL 60645
Phone No: (773) 764 - 8274

ISBN 978-0-9910344-8-2

فہرستِ مضامین

صفحہ نمبر

- کلماتِ بابرکات ۱۷
- مقدمہ ۱۸
- سورہ رحمٰن کی آیات کلمے اور حروف ۱۹
- سورۂ رحمٰن کا بنیادی مضمون اور ماقبل سورت سے مناسبت ۱۹
- سورۂ رحمٰن مکی ہے یا مدنی؟ ۲۰
- سورۂ رحمٰن کا شانِ نزول ۲۱
- قرآن کی زینت ۲۱
- جنت میں اللہ پاک سورۂ رحمن کی تلاوت فرمائیں گے ۲۲
- رحمٰن کے معنٰی ۲۲
- رحمٰن اور رحیم میں فرق ۲۲
- مخلوقات کی پیدائش محض رحمتِ خداوندی کا اثر ۲۴
- صفتِ رحمٰن اور رحیم سے نظام کائنات کی بقاہے ۲۴
- اللہ پاک صفتِ انفعال سے پاک ہیں ۲۵
- انعامات کے ذکر کا مقصد ۲۶
- عبادت ونافرمانی سے اللہ پاک مستغنی ہیں ۲۷
- تعلیمِ قرآن محض رحمتِ خداوندی ۲۸
- تعلیمِ قرآن کی نسبت حق تعالیٰ نے اپنی جانب کیوں کی؟ ۲۹
- حق تعالیٰ سے غایتِ تعلق کا ثمرہ ۳۰
- اسلوب قرآنی سے متعلق ایک نکتہ ۳۱
- سورۂ رحمٰن اور سورۂ علق میں اسلوب بیان میں فرق ۳۳
- تعلیم کو تخلیق پر مقدم کرنے کی وجہ ۳۳

✽ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ	۳۴
✽ قیامت میں جانوروں کے ساتھ بھی انصاف ہو گا	۳۵
✽ تعلیمِ قرآن سے مراد	۳۶
✽ تلاوتِ قرآن سے متعلق شیطانی دھوکہ	۳۶
✽ تلاوتِ قرآن کے بارے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول	۳۷
✽ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام	۳۷
✽ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن پاک سننا	۳۸
✽ تلاوت میں مشغول آدمی کی اللہ کے ہاں اہمیت	۳۹
✽ تلاوت نہ کرنے والا ویران گھر کی طرح ہے	۳۹
✽ قرآن مجید کے ایک حرف پڑھنے پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں	۳۹
✽ قرآن پاک آنکھوں کی عبادت کا حصہ ہے	۴۰
✽ قلب کی بہار اور غم سے نجات کا ذریعہ	۴۱
✽ قرآن پاک سے روکنے والے موجودہ دور کے ہتھکنڈے	۴۱
✽ ترکِ قرآن پر قیامت میں رسول کی شکایت	۴۲
✽ نعمتِ تخلیق	۴۳
✽ انسان سے کون مراد ہیں	۴۳
✽ قوتِ گویائی بھی عظیم نعمت ہے	۴۴
✽ بیان سے کیا مراد ہے؟	۴۴
✽ قوت گویائی کا مقصد تعلیم قرآن ہے	۴۶
✽ ایک نکتہ	۴۶
✽ سورج اور چاند کا نظام	۴۷
✽ سورج کی حقیقت	۴۸

سورج کے چند دنیوی فوائد	۴۹
ایک لقمہ کے پیچھے خدائی نظام	۴۹
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نعمت کی تعظیم کرنا	۵۰
حضرت مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ	۵۱
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۵۱
سورج دینی نعمت بھی ہے	۵۲
نمازِ عشاء امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے	۵۳
وقتِ عشاء کے سلسلہ میں ایک غلط فہمی	۵۴
نمازوں کے اوقات منصوص ہیں	۵۴
وقتِ عشاء احادیث کی روشنی میں	۵۵
وقتِ عشاء کے بارے میں حضرت ابو بکر، عمر، عائشہ اور معاذ رضی اللہ عنہم کا مسلک	۵۶
وقتِ عشاء کے بارے میں مفتیٰ بہ قول اور علماء دیوبند کے فتاویٰ	۵۶
وقتِ فجر اور مغرب کے بارے میں ایک اصول	۵۷
اوقات سے متعلق نئی اور پرانی تحقیق کا تقابل	۵۷
ایک غلط فہمی	۵۹
نمازِ ظہر کے سلسلہ میں ایک گمراہی	۶۰
جمع بین الصلاتین پر وعید	۶۰
جمع بین الصلاتین کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان	۶۰
جمع بین الصلاتین والی روایات کے جوابات	۶۱
اوقاتِ نماز کی عدمِ رعایت قرآن مجید سے بغاوت ہے	۶۱
چاند کی نعمت	۶۲
کیا احکامِ شرع کا مدار حساب پر ہے؟	۶۲

- نظامِ کائنات کا مقصد ٦٤
- نجم و شجر کے سجدہ سے کیا مراد ہے؟ ٦٥
- پتوں کے فوائد ٦٧
- درختوں کے پتے معرفتِ الٰہی کا ذریعہ ہیں ٦٧
- ابتدائی نعمتوں کے درمیان حرف واو کے عدم ذکر کی حکمت ٦٨
- پہلی تین صفات کی نسبت حق تعالیٰ نے اپنی جانب کیوں کی؟ ٦٩
- بیلوں کو درختوں پر مقدم کرنے کی وجہ ٧٠
- ارض و سماء کی صرف دو دو نعمتوں ہی کا ذکر کیوں؟ ٧٠
- اللہ اور رسول سے محبت کی پہچان اور اس کی حقیقت ٧١
- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھکان دُور کرنے کا ذریعہ ٧٢
- روح کی بلوغت ٧٣
- محبت کے حصول کا طریقہ ٧٤
- نظامِ عالم کی بقا عدل و انصاف پر ہے ٧٥
- صفتِ عدل سے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح ٧٦
- میزان میں خسارہ نہ کریں ٧٨
- ترازو کو وزنی رکھنے کی شکلیں ٧٩
- ناپ تول صرف ترازو میں نہیں ٨٠
- تعلقات کی بقا معاملات کے عدل پر موقوف ہے ٨٠
- جھکتا ہوا تولیں ٨١
- ایک عجیب واقعہ ٨١
- زمین مخلوق کے لئے بچھائی گئی ٨٢
- ارض و سماء کے درمیان میزان کے ذکر کی حکمت ٨٣

- فاکہہ اور نخل کا مصداق ۸۴
- بھوسہ کے فوائد ۸۴
- لفظِ ''آلاء'' کی تحقیق ۸۵
- صفتِ ''رب'' کے ذکر کی وجہ ۸۶
- خطاب میں تثنیہ کا صیغہ کیوں؟ ۸۶
- ''فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ'' کا جواب ۸۶
- نعمتوں کی تکذیب کی صورتیں ۸۷
- سورۂ رحمٰن کی تین بنیادی نعمتیں ۸۸
- حضرتِ آدم علیہ السلام کی تخلیق ۸۸
- زمین اور فرشتوں کا مکالمہ ۸۹
- ایک اشکال اور اس کا جواب ۹۰
- انسان کی تخلیق کے مراحل ۹۱
- انسان عالم اصغر ہے ۹۲
- انسان کی سارے عالموں پر افضلیت کی وجوہات ۹۲
- تخلیق کے ذکر کا مقصد ۹۳
- جنات کی تخلیق ۹۳
- جنات کا ثبوت قرآن اور احادیث سے ۹۴
- جنات کی ذریت کا سلسلہ ۹۵
- جنات کا کسی کی شبیہ اختیار کرنا ۹۶
- جنات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں متشکل نہیں ہوسکتے ۹۶
- کیا جنات احکام شرع کے مکلف ہیں؟ ۹۷
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنات میں بھی تبلیغ فرمائی ۹۷

- کیا جنات جنت میں داخل ہوں گے؟ ۹۹
- ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۱۰۰
- جنات کا انسانوں کو ستانا اور ان کے اجسام میں داخل ہونا ۱۰۱
- آپ ﷺ کا جن کو اتارنا ۱۰۱
- قصہ خرافہ ۱۰۲
- بچوں کی جنات کے شر سے حفاظت ۱۰۲
- جنات کی نظر سے پناہ ۱۰۳
- ملائکہ کے ذریعہ شیاطین سے انسانوں کی حفاظت ۱۰۳
- جنات کے بارے میں معتزلہ اور اہلِ حق کا رجحان ۱۰۳
- مذکورہ مسئلہ میں علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہما کی تصریحات ۱۰۴
- شیاطین اور جنات کا علاج قرآن سے ۱۰۵
- آیۃ الکرسی اور دیگر آیات سے علاج ۱۰۵
- تعویذات اور جھاڑ پھونک کی ممانعت کا محمل ۱۰۶
- تعویذ سے علاج کی شرائط ۱۰۷
- کیا تعویذ باندھنا اور اس کو دھو کر پلانا غیر شرعی عمل ہے؟ ۱۰۸
- تعویذ لٹکانے میں حضرات صحابہ اور تابعین کا عمل ۱۰۹
- تعویذ لٹکانے اور باندھنے کے بارے میں ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۱۱۰
- مشرق اور مغرب کا رب ۱۱۱
- مشرق اور مغرب کو تثنیہ کیوں لایا گیا؟ ۱۱۱
- ایک جہالت کا ازالہ ۱۱۲
- دو دریاؤں کا بغیر اتصال کے جاری ہونا ۱۱۳
- کھارا پانی اور میٹھا پانی دونوں نعمت ہیں ۱۱۳

❁ پانی میں نظام مدوجزر سے ایک غلط فہمی	۱۱۴
❁ ایک بزرگ کا واقعہ	۱۱۵
❁ موتی اور مونگے بھی نعمت ہیں	۱۱۵
❁ ایک اشکال اور اس کے جوابات	۱۱۶
❁ موتی اور مونگے کے فوائد	۱۱۷
❁ نعمتوں کی ترتیب پر ایک نظر	۱۱۸
❁ اسلام اور زیب وزینت	۱۱۹
❁ سمندری جہاز پر ملکیت اللہ ہی کی ہے	۱۱۹
❁ ایک نکتہ	۱۱۹
❁ کشتیوں نے گویا ملکوں کو سمیٹ دیا	۱۲۰
❁ کشتیوں کی پہاڑوں سے تشبیہ	۱۲۰
❁ قرآن کا اعجاز	۱۲۱
❁ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بحری جہاز سے ایک تمثیل	۱۲۱
❁ ہر شئ کو فنا ہے	۱۲۲
❁ وجہٌ سے کیا مراد ہے؟	۱۲۳
❁ فنائیت میں زمین کی تخصیص کیوں؟	۱۲۳
❁ ایک اعتراض اور اس کا جواب	۱۲۳
❁ سزاؤں کا ذکر بھی نعمت ہے	۱۲۴
❁ سزاؤں کے ذکر پر بھی شکر گزار ہونا چاہئے	۱۲۴
❁ مصیبت کا ذکر نعمت ہونے کی ایک مثال سے وضاحت	۱۲۵
❁ فرشتوں کی ایک خوش فہمی کا ازالہ	۱۲۶
❁ ذاتِ الٰہ بڑی باعظمت اور بااحسان ہے	۱۲۶

- انعام اور اکرام میں فرق ۱۲۷
- صفاتِ جلال واکرام کی فضیلت ۱۲۷
- مخلوقات اللہ کی بھکاری ہیں ۱۲۸
- فرشتے بھی اللہ کے محتاج ہیں ۱۲۸
- انسان توضرورتوں کا مجموعہ ہے ۱۲۹
- سوال بزبانِ قال یاحال ۱۲۹
- مخلوقات کی حقیقت ۱۳۰
- دعاعبادتوں کا مغزاور رحمتوں کا سبب ہے ۱۳۱
- نعمتوں کا حصول بطورِ تجدد امثال ہے ۱۳۱
- باعتبارِ قرب الٰہی انسان کے درجات ۱۳۳
- (۱) فقیر اللہ ۱۳۳
- (۲) امین اللہ ۱۳۴
- (۳) ولی اللہ (۴) خلیفۃ اللہ (۵) عبد اللہ ۱۳۴
- اس کی ہر آن الگ شان ہے ۱۳۵
- یہود کے ایک نظریہ کی تردید ۱۳۵
- ایک اشکال اور اس کا جواب ۱۳۶
- "کل یوم ھوفی شأن" سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ ۱۳۶
- "کل یوم ھوفی شأن" کی ایک اور تفسیر ۱۳۷
- اللہ پاک بندوں کے حساب کے لئے فارغ ہونے والے ہیں ۱۳۷
- حق تعالیٰ کے فارغ ہونے سے کیا مراد ہے؟ ۱۳۸
- "ثقلان" کی تشریح ۱۳۹
- حق تعالیٰ کا ایک چیلنج ۱۴۰

- جنات کو مقدم کرنے کی وجہ ۱۴۱
- قربِ قیامت آسمان کا پھٹنا اور فرشتوں کا اترنا ۱۴۱
- ایک جہالت کا ازالہ ۱۴۲
- جہنم کے شعلے اور دھواں ۱۴۲
- دنیا کی آگ جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے ۱۴۳
- جہنم کی چنگاریاں محلات کی طرح ہوں گی ۱۴۳
- آسمان پھٹ کر سرخ ہو جائے گا ۱۴۴
- آسمان کے سرخ نظر آنے کی وجہ ۱۴۴
- گنہگاروں سے سوال کی نوعیت ۱۴۵
- ایک اعتراض اور اس کے جوابات ۱۴۵
- انسان کے اعضاء خود اس کے خلاف گواہی دیں گے ۱۴۶
- انسان کے اعضاء خدا کے کیمرے ۱۴۷
- مجرموں کی شناخت ان کے چہروں سے ہو گی ۱۴۷
- ایک دفعِ دخلِ مقدر ۱۴۷
- گنہگاروں کے چہروں کی کیفیت ۱۴۸
- فرشتوں کی پکڑ سے کمر ٹوٹ جائے گی ۱۴۸
- نیک مؤمنین کی پہچان؟ ۱۴۸
- یتیموں کا مال کھانے والوں کی نشانی ۱۴۹
- سود خوروں کی نشانی ۱۴۹
- چغلخوروں کی نشانی ۱۵۰
- زکوۃ نہ دینے والوں کی نشانی ۱۵۰
- غاصبین کی نشانی ۱۵۰

✤ متکبرین کی نشانی	۱۵۱
✤ جہنم کی گہرائی	۱۵۱
✤ قیامت کے دن کی ہولناکی	۱۵۱
✤ حمیم اور آن کی تفسیر	۱۵۲
✤ اہل جہنم کے لئے پیش کردہ پانی کی سختی	۱۵۳
✤ اہلِ جہنم کی جسامت	۱۵۳
✤ ایک بزرگ کا ملفوظ	۱۵۴
✤ خوفِ الٰہی کے انعامات	۱۵۵
✤ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ	۱۵۶
✤ "وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ" میں "ربّ" ذکر کرنے کی وجہ	۱۵۶
✤ وَلِمَنْ خَافَ کا شانِ نزول	۱۵۷
✤ رب کے سامنے خوف اور قیام کا مطلب	۱۵۷
✤ سوالاتِ خمسہ سے کسی کو فرار نہیں	۱۵۷
✤ روزِ قیامت حق تعالیٰ براہِ راست سوال فرمائیں گے	۱۵۸
✤ حساب یسیر کی دعا مانگنی چاہئے	۱۵۸
✤ خوف اور خشیت میں فرق	۱۵۹
✤ خشیت کا درجہ خوف سے بڑھ کر	۱۶۰
✤ خوفِ الٰہی ہر حکمت کی اصل ہے	۱۶۰
✤ سب سے زیادہ خشیت والے	۱۶۱
✤ خشیت الٰہی سے مکھی کے سر کے برابر بھی آنسو نکلنے پر جہنم حرام	۱۶۱
✤ صحابہ رضی اللہ عنہم کا خوف	۱۶۲
✤ پیغمبروں پر جلالِ الٰہی کا اثر	۱۶۲

* خوفِ خدا رکھنے والے ایک نوجوان کا واقعہ ۱۶۲
* خوف اور خشیت کیسے پیدا کی جائے؟ ۱۶۵
* جنتیں کیسی ہوں گی؟ ۱۶۵
* دو جنتیں کیوں؟ ۱۶۶
* ترکِ گناہ پر بھی ثواب ہے ۱۶۶
* جسم اور روح کے لئے علاحدہ جنت ۱۶۶
* باغوں اور درختوں کی کیفیات ۱۶۷
* جنتی چشموں کی صفات ۱۶۸
* چشموں کا بہاؤ اہلِ جنت کے تابع ہو گا ۱۶۸
* جنت کی چار نہریں ۱۶۸
* چشموں کے کنکر یاقوت اور زمرد کے اور مٹی مشک کی ہو گی ۱۶۹
* پھلوں کی اقسام ۱۷۰
* باغ اور چشموں کے درمیان نہروں کے ذکر کی وجہ ۱۷۰
* پھلوں کے ذائقے ۱۷۱
* جنت اور دنیا کے پھلوں میں صرف نام کا اشتراک ہے ۱۷۲
* حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ ۱۷۲
* جنت کے فرش کا استر ۱۷۳
* ظاہرِ فرش کیوں مخفی رکھا گیا ۱۷۳
* جنت کے فرش کا ظاہر ۱۷۴
* پھل اہلِ جنت کے پاس خود آئیں گے ۱۷۴
* جنت میں انسان ساکن اور نعمتیں متحرک ہوں گی ۱۷۴
* اڑتا ہوا پرندہ خوان بن کر حاضر ہو جائے گا ۱۷۴

- حوروں کی صفات ۱۷۵
- ستر جوڑوں سے پنڈلی کا گودا نظر آئے ۱۷۵
- حور کی جھلک سے عالم روشنی اور خوشبو سے بھر جائے ۱۷۶
- حور کے لعاب سے سات سمندر میٹھے ہو جائیں ۱۷۶
- حور کے کنگن کی جھلک سے سورج بے نور ہو جائے ۱۷۶
- کیا جنت میں استنجاء کی حاجت ہو گی ۱۷۶
- حضرت صوفی غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ ۱۷۷
- جنتی مردوں کی قوت ۱۷۸
- کیا جنت میں بچے پیدا ہوں گے؟ ۱۷۸
- حوریں یاقوت اور مرجان کی طرح ہوں گی ۱۷۹
- احسان کی تفسیر ۱۸۰
- دنیا میں کوالٹی ہے تو دین میں کیوں نہیں؟ ۱۸۱
- حضرت صوفی غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ۱۸۲
- اعمال میں صفتِ احسان نہ ہونے کا اثر ۱۸۲
- مؤمنین کے لئے مزید دو جنتیں ....
- مذکورہ جنتیں کس کے لئے ہوں گی؟ ۱۸۴
- پہلی دو جنتیں افضل ہیں یا بعد کی ۱۸۴
- دو دو جنتوں کا ذکر کیوں؟ ۱۸۴
- ایک نکتہ ۱۸۵
- ”فَبِأَیِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ“ کا عملی شکریہ ۱۸۶
- نیت کی تبدیلی کا اثر ۱۸۶
- دونوں باغ سبز ہوں گے ۱۸۷

- چشموں سے مشک و عنبر اور کافور کی بارش ۱۸۸
- جنت کا کھجور ۱۸۸
- جنت کا اَنار ۱۸۹
- جنت کے پھلوں سے لباس اور حور نکلیں گے ۱۸۹
- خوبصورت اور خوب سیرت حوریں ۱۹۰
- حسان اور خیرات میں فرق ۱۹۰
- سیرت ہی اصلی صورت ۱۹۱
- ایک لطیفہ ۱۹۱
- جنت کی نعمتیں ابدی ہیں ۱۹۲
- جنت کی شاپنگ (shopping) ۱۹۲
- دیدارِ الٰہی کی لذت ۱۹۳
- مومن عورتوں اور حوروں کا مکالمہ ۱۹۳
- مخطوبہ میں صفتِ محبت ملحوظ رکھنی چاہیے ۱۹۴
- پیغامِ نکاح کے وقت خواتین میں محبت پہچاننے کا طریقہ ۱۹۴
- دنیا کی عورتوں کا جواب ۱۹۴
- حور زیادہ خوبصورت ہوگی یا مومن عورت؟ ۱۹۵
- حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ ۱۹۵
- حوروں کی تعریف ۱۹۶
- حوریں کیسے پیدا کی گئیں؟ ۱۹۶
- حوروں کا نیک بندوں کی تمنا کرنا ۱۹۶
- دنیا کی عورتوں کا جھگڑا دیکھ کر حوروں کا کوسنا ۱۹۷
- جنت کے خیمے ۱۹۷

- حوروں کی آنکھیں اور نفوس غیروں کے خیال سے پاک ہوں گے .. ۱۹۸
- رفرف کیا ہے؟ ۱۹۹
- عبقری کی وضاحت ۲۰۰
- جنتی تکیہ لگائے بے فکر بیٹھے رہیں گے ۲۰۰
- برکت کے معنٰی ۲۰۰
- افتتاح رحمٰن سے اور اختتام اکرام سے ۲۰۱
- ایک نکتہ ۲۰۲
- اصل لذت اسمِ الٰہی میں ہے ۲۰۲
- اللہ کے نام کی حلاوت ۲۰۳
- اہلِ جنت کے لئے کلمہ توحید ٹھنڈے پانی کی طرح ہے ۲۰۳
- جنت میں بھی ذکر اللہ سانس کی طرح جاری رہے گا ۲۰۳
- اہل جنت کی تحمید اور تسبیح کی وجہ ۲۰۴
- ذکر اللہ آفتِ زبان سے حفاظت کا سبب ہے ۲۰۴
- ذکر روح کی تقویت کا ذریعہ ہے ۲۰۴
- ذکر کا ناغہ روح کا فاقہ ۲۰۵
- روح کی غذا اور دوا ۲۰۵
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے زمانے میں مومنین کی غذا ۲۰۵
- ذکر کی صورتیں ۲۰۶

❋ ❋ ❋

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلماتِ بابرکات

پیرِ طریقت رہبرِ شریعت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

الحمد للہ بفضلہ تعالیٰ مفسّر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد نوال الرحمن صاحب زیدت فیوضہم کے موضوعاتی درسِ قرآن بضمن سورۃ الرحمن اشاعت کیلئے تیار ہے، سابقہ درسِ قرآن بضمن سورۂ فاتحہ اورآیۃ الکرسی کی طرح امید ہے کہ اس کو بھی شرف قبول حاصل ہوگا، اور نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا اور سابقہ دروس کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جائیگا۔

بندہ نے اس کے کچھ حصہ کا مطالعہ کیا بہت نفع محسوس ہوا، مضامین کی آمد، آیات کی وضاحت اور سامعین کے اذہان کی رعایت خوب ہے، اس قدر شرح وبسط کے ساتھ علمی مواد کسی سورت کے ذیل میں یکجا بہت کم دیکھنے کو ملے گا۔ اللہ کرے زورِ بیان اور زیادہ ہو۔

مفتی صاحب کے دونوں فرزندان عزیزم مفتی عابد قاسمی سلمہ وعزیزم مفتی ساجد سلمہ نے تخریج کا قابلِ قدر کام کیا اور عزیزم مفتی ساجد قاسمی سلمہ نے بطور مقدمہ اپنی اولین بہترین منظوم کوشش کی ہے جو بڑی حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ اللہ کرے کہ اسی طرح مولانا موصوف کے درس کا سلسلہ جاری رہے اور لوگ زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔

محمد جمال الرحمن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از قلم مفتی محمد عطاء الرحمٰن ساجد قاسمی ابن مفتی محمد نوال الرحمٰن

حضرتِ علامہ ہیں مفتی نوال صاحبِ علم وعمل ہیں با کمال
ہیں حدیث اور فقہ میں وہ پیش پیش اور زمانہ میں وہ یکتا بے مثال
آپ کی تقریر اور تدریس سے ایک عالم فیض یاب اور مالا مال
ہے زباں ان کی سہل تر اے اخی خوش کلامی میں نہیں کوئی مقال
یہ مدارس اور مراکز خوانقاہ آپ سے ہیں با منور با جمال
کتنے ہی شعبوں کے دینی ذمہ دار ہے کرم ان پر یہ ربِّ ذوالجلال
خوش مزاجی آپ کی ہے لاجواب بے تکلف بے تصنع خوش خصال
آپ کی جودو سخا ہے بے نظیر خالی رہتا ہے نہیں دستِ سوال
آپ کا سایہ ہو ہم پر دیر تک آپ جیتے ہی رہیں کتنے ہی سال
فضلِ حق سے آج ہم پھر شاد ہیں ہوگئی تفسیرِ رحمن جو یہ سال
از روایات اور نکاتِ علم سے ہے مرصع اور مزین یہ مقال
علم و حکمت اور فوائد سے بھرا آپ کا مجموعہ ہے یہ بے مثال
ناسپاسی ہوگی گرمیں چھوڑدوں ذکرِ عارف اور طیب کا خیال
اور بسعیِ مفتی احمد اور نذیر تیرے ہاتھوں میں ہے یہ بے قیل و قال
مفتی عابد کا بہت ممنون ہوں اس ادارہ کے وہ ناظم ہیں بحال
جن کی ہے تخریج و ترتیب اور ضبط وہ بذاتِ خود ہوئے ہیں با کمال
معتمد کا بھی بہت ممنون ہوں ہے نظامت میں معینِ بے مثال
میری یہ ہیں ابتدائی کوششیں میں کہاں سے لاسکوں ان میں کمال
قارئیں سے ہے عطا کی آرزو جو بھی لغزش ہو لکھیں بے قیل و قال
بارگاہِ رب میں ہے یہ التجا میری یہ کاوش ہو مقبول اور سوال

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴

”وہ رحمٰن ہی ہے، جس نے قرآن کی تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا، (پھر) اس کو گویائی سکھائی۔“

کئی دنوں کے بعد درس کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جارہا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی عنوان نہیں تھا، ہمارے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ سورۂ رحمٰن شروع کیا جائے، اس سے پہلے سورۂ یٰسین، سورۂ کہف اور سورۂ یوسف کا بھی درس ہو چکا ہے، اور سورۂ رحمٰن سے بھی لوگ کافی دلچسپی رکھتے ہیں، اور اس کی بھی کافی فضیلتیں ہیں، اس لیے ارادہ ہوا کہ اس سورت کا درس دیا جائے، چنانچہ اس کی چند آیتیں آپ کے سامنے تلاوت کی گئیں۔

سورہ رحمٰن کی آیات کلمے اور حروف:

اس سورت میں ۷۸ آیتیں، ۳۵۱ کلمے اور ۱۶۳۶ حروف ہیں۔[1]

اس سورت کی تفسیر سے قبل اس کے مضمون، مقامِ نزول، شانِ نزول اور فضائل سے متعلق چند باتیں ذہن میں رکھیں۔

سورۂ رحمٰن کا بنیادی مضمون اور ماقبل سورت سے مناسبت:

پہلی بات یہ ہے کہ اس کا موضوع کیا ہے؟ اللہ پاک نے اس سورت میں کیا کیا مضامین بیان فرمائے ہیں؟ تو بنیادی طور پر یہ بات یاد رکھیے کہ اس سورت میں اللہ پاک نے اپنی نعمتوں کو بیان فرمایا ہے، اور ان نعمتوں کی بنیاد پر لوگوں پر احسان جتایا ہے۔

اس سورت سے قبل سورۂ قمر ہے۔ دونوں میں مناسبت یہ ہے کہ سورۂ قمر میں اللہ پاک نے نافرمانوں کے لیے سزاؤں کا ذکر فرمایا ہے اور مختلف قوموں پر عذاب و سزا کا تذکرہ کیا ہے۔ جگہ جگہ تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] کشف البیان: ۹/۱۷۶۔

﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ﴾ "کیسا تھا میرا عذاب"لیکن اس کے بالمقابل سورۂ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے، جس طرح سورۂ قمر میں ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ﴾ کثرت سے ہے اسی طرح سورۂ رحمٰن میں ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ کثرت سے ہے، سورۂ قمر میں اللہ تعالیٰ کے معجزۂ قدرت اور معجزۂ ہیبت کا بیان ہے تو اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے معجزۂ رحمت کا بیان ہے، جس طرح سورۂ قمر میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نافرمانوں کے لیے سزاؤں کا ذکر ہے، جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے، تاکہ لوگ اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اسی طرح اس سورت میں نعمتوں کا ذکر ہے تاکہ لوگ اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کا قرب حاصل کریں۔

سورۂ رحمٰن مکی ہے یا مدنی؟

دوسری بات یہ ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی یا مدینہ میں؟ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے چند روایات کے پیش نظر اس آیت کے مکی ہونے کو ترجیح دی ہے، من جملہ ایک روایت سنن ترمذی میں یوں ہے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے سامنے سورۂ رحمٰن کی تلاوت فرمائی، وہ سن کر خاموش ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے لیلۃ الجن میں یہ سورت جنات کے سامنے سنائی تو اس سورت نے تمہارے مقابلہ میں ان پر زیادہ اثر کیا، کیونکہ جب میں ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ کہتا تو وہ کہتے: "لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ"[1] "اے پروردگار ہم آپ کی کسی نعمت کی تکذیب اور ناشکری نہیں کریں گے، آپ ہی کے لئے حمد ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت مکی ہے، کیونکہ لیلۃ الجن مکہ میں واقع ہوئی ہے، اس کے علاوہ اور بھی روایتیں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہیں۔

---

[1] سنن ترمذی: کتاب التفسیر: باب ومن سورۃ رحمن، ۳۹۹/۵۔

سورۂ رحمٰن کا شانِ نزول:

تیسری بات یہ ہے کہ اس کا شانِ نزول کیا ہے؟اور اس سورت کو اللہ پاک نے کیوں نازل فرمایا ہے؟اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ کے ہاں اللہ پاک کے اسماء میں ”رحمن“ کا نام زیادہ معروف نہیں تھا اور وہ دوسرے ناموں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کو جانتے تھے،جب اُن سے سورۂ فرقان آیت نمبر ۶۰ میں کہا گیا کہ رحمٰن کی عبادت کرو تو کہنے لگے:

” وَمَا الرَّحۡمٰنُ“ ”رحمٰن کیا چیز ہے؟“تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ رحمٰن نازل فرمائی۔[۱] اور بتایا کہ ”رحمٰن“ یہ ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے نزول کا ایک اور واقعہ بیان فرمایا ہے کہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ کہنے لگے کہ یمامہ کا ایک آدمی مسیلمۂ کذاب (نعوذ باللہ) آپ کو یہ کلام سکھاتا ہے تو اللہ پاک نے جواب دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرآن رحمٰن سکھاتا ہے۔[۲]

قرآن کی زینت:

چوتھی بات یہ ہے کہ اس سورت کے فضائل کیا ہیں؟اس کے فضائل کے بارے میں ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”لِكُلِّ شَيْئٍ عَرُوْسٌ وَعَرُوْسُ الْقُرْآنِ الرَّحْمٰنُ“[۳] ”ہر شئی کی ایک زینت،ایک خوبصورتی اور ایک جمال ہوتا ہے اور قرآن کی زینت سورۂ رحمٰن ہے“۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سورہ رحمٰن پڑھتا ہے تو اللہ پاک اس کی کمزوری پر رحم فرماتے ہیں اور وہ بندہ اللہ پاک کے احسانات کو ادا کر دیتا ہے۔[۴]

۱: تفسیر اضواء البیان:۷/۴۸۸۔ ۲: تفسیر قرطبی:۱۷/۱۵۲۔ ۳: شعب الایمان: فصل فی فضائل السورۃ والآیات:۲۲۶۵۔ ۴: الکشف والبیان:۹/۱۷۶۔

جنت میں اللہ پاک سورۂ رحمٰن کی تلاوت فرمائیں گے:

ایک حدیث میں ہے کہ جنت میں ہر جمعہ اللہ تبارک وتعالیٰ سورۂ رحمٰن کی تلاوت فرمائیں گے۔ جمعہ سے دنیا کا یہ آٹھ دن والا جمعہ مراد نہیں ہے، کیونکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس سورت کو سنیں گے تو مست ہوجائیں گے اور سینکڑوں سال اسی غشی میں گزر جائیں گے، پھر ان لوگوں کو ہوش آئے گا۔ ذرا غور کریں کہ جب براہ راست اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی تلاوت فرمائیں گے تو اس میں کتنا مزہ آئے گا؟

رحمٰن کے معنیٰ:

"رحمٰن" مبالغے کا صیغہ ہے اور "رحمت" سے بنا ہوا ہے۔ "رحیم" بھی مبالغے کا صیغہ ہے اور وہ بھی "رحمت" سے بنا ہوا ہے۔ "رحمٰن" کے معنی بہت ہی زیادہ مہربان کے ہیں، اصطلاح میں رحمٰن کہتے ہیں اس کو جس کی رحمت عام ہو اور اللہ کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں ہے جس کی رحمت سب پر عام ہو۔ اس میں مؤمنین، کافرین، فاسقین اور فاجرین سب شامل ہیں، اس لئے اس نام کا رکھنا کسی اور کے لئے درست نہیں ہے۔

رحمٰن اور رحیم میں فرق:

لفظِ رحمٰن عام طور پر حق تعالیٰ کی نِعَمِ سابقہ یعنی مخلوقات کے وجود کی نعمت کے لیے آتا ہے اور ان نِعَمِ سابقہ میں کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ہے اس وجہ سے صرف "رحمن" کسی کا نام نہیں ہو سکتا۔ اور رحیم اس کو کہتے ہیں جس کی رحمت خاص ہو، اور اس کا اطلاق نِعَمِ لاحقہ یعنی وجود کے بعد کی نعمتوں پر ہوتا ہے۔ چونکہ ایک طرح سے مخلوق ان کو انجام دیتی ہے مثلاً کھلانا، پلانا، پہنانا، کسی ضرورت کا

پوری کرنا، اس لئے رحیم کا لفظ مخلوق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے،[۱] اسی وجہ سے حضور سے حضور پاک ﷺ کے اسمائے گرامی میں ''رحیم'' بھی ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾[۲]

مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ پاک کو رحمٰن دنیا کے اعتبار سے اور رحیم آخرت کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔[۳] کیونکہ دنیا میں اللہ پاک کی رحمت سب کو عام ہے، کافر، مومن اور منافق سب اس میں شامل ہیں، اور آخرت میں اللہ پاک کی خاص رحمتیں ہوں گی، جس میں صرف مسلمان شامل ہوں گے، وہاں رحمت اور نعمت میں مسلمانوں کے علاوہ کوئی شامل نہیں ہوگا، اس لئے اللہ پاک کو آخرت کے اعتبار سے رحیم کہا جاتا ہے۔[۴]

اور کبھی رحمٰن کہتے ہیں تو رحیم کے معنیٰ مراد ہوتے ہیں اور رحیم کہتے ہیں تو رحمٰن کے معنیٰ مراد ہوتے ہیں، اور یہ دونوں لفظ ''رَحْمٌ'' سے بنے ہوئے ہیں، عربی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جیسے ہی لفظ بدلتا ہے، اس میں کمی بیشی ہوتی ہے تو اُس کے معنیٰ بھی بدل جاتے ہیں۔ رحم میں الف اور نون کا اضافہ ہوا تو رحمٰن مبالغہ کا صیغہ بن گیا، اور ی کا اضافہ ہوا تو صفت کا صیغہ رحیم بن گیا۔ جب کسی ذات کی کوئی صفت بتانا ہو تو اُس کے لیے یہ وزن استعمال کرتے ہیں ''کَرِيْمٌ، رَحِيْمٌ، عَزِيْزٌ'' وغیرہ۔ جب کسی میں کسی وصف کی زیادتی اور شدت کو بتلانا ہوتا ہے تو اُس کے لیے مبالغہ کا صیغہ استعمال کرتے ہیں ''عَلَّامٌ، رَحْمٰنٌ، فَعَّالٌ'' وغیرہ۔ یہ الفاظ بھی اپنے ایک مستقل مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں اور وہ الفاظ بھی اپنے ایک مستقل مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔

۱: تفسیر رازی: ۴۹/۱۵۔ ۲: التوبۃ: ۱۲۸۔ ۳: تفسیر رازی: ۴۹/۱۵۔ ۴: روح المعانی: ۲۶/۱۔

نوٹ: رحمن اور رحیم میں فرق اور اس کی تفصیل جاننے لئے حضرت کے سورۂ فاتحہ کے افادات کی طرف بھی رجوع کرسکتے ہیں۔

"رَحْمٰنْ اور رَحِيْمٌ" دونوں اسماء مستقل اور بامعنٰی لفظ ہیں اور ان کی مستقل حیثیت ہے۔

مخلوقات کی پیدائش محض رحمتِ خداوندی کا اثر ہے:

بہر حال یہ اسماء لغو نہیں ہیں بلکہ تمام مخلوقات کی پیدائش محض اُن کی رحمت ہی کی وجہ سے ہے، اورانہیں کے اسماءِ مبارکہ کا اثر ہے۔ کیونکہ پیدا ہونے میں کسی کا کوئی استحقاق نہیں تھا، کسی کا کوئی مطالبہ نہیں تھا، کسی کا کوئی قرضہ نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات کی یہ پالیسی (Policy) بنائی:

"لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ كِتَابًا عِنْدَهٗ غَلَبَتْ، أَوْ قَالَ سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ"[1]

"جب اللہ پاک نے مخلوق کو پیدا کیا تو اپنے پاس کتاب (لوح محفوظ) میں لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غصے پر غالب رہے گی یا سبقت کرے گی۔"

صفتِ رحمٰن اور رحیم سے نظام کائنات کی بقا ہے:

یہ دونوں اسماء ایسے ہیں کہ انسان اور سارا نظامِ کائنات انہیں صفات کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اسی صفت کے نتیجے میں آج ہم جی رہے ہیں اور یہ کائنات باقی ہے۔ ان کو ہماری ضرورت نہیں، بلکہ ہم ان کے رحم و کرم پر پڑے ہوئے ہیں، جب مخلوقات نہیں تھی اُس وقت بھی انہیں کسی کی ضرورت نہیں تھی، وہ تنہا تھے، "كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهٗ، وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ، وَكَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْءٍ"[2]

"اللہ تعالیٰ تھے اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی، اور اس کا عرش پانی پر تھا، پھر اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، اور کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں ہر چیز لکھ دی"۔

---

[1] صحیح بخاری: کتاب التوحید: باب قول اللہ تعالیٰ بل ھو قرآن مجید، ۲۴/ ۴۴۰۔

[2] صحیح بخاری: کتاب التوحید: باب وکان عرشہ علی الماء، ۲۴/ ۲۶۶۔

اللہ پاک صفتِ انفعال سے پاک:

یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے، انہوں نے پہلے اپنا ایک اصول بنایا کہ میری رحمت میرے غصے پر غالب رہے گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور غصے سے مغلوب نہیں ہوتے۔ جیسے مخلوق رحم کے جذبے میں آکر مغلوب ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس طرح مغلوب نہیں ہوتے۔ ماں اپنے بچے پر رحم کرنے میں مجبور ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحم کرنے میں مجبور نہیں ہوتے، بلکہ اپنے ارادے سے رحم کرتے ہیں۔ آدمی اپنے دُشمن پر غصہ کرنے میں مجبور ہو جاتا ہے اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے مخالف پر غصہ کرنے میں مغلوب نہیں ہوتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کسی پر غصہ کیا یا کسی کو سزا دی تو اپنے ارادے سے کیا اور بغیر کسی مغلوبیت کے کیا، غصہ بھی اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہوتا ہے کہ کہاں غصہ کرنا ہے؟ کس پر غصہ کرنا ہے؟ ساری مخلوق نافرمانی کرکے اللہ تعالیٰ کو غصہ دلا رہی ہے لیکن وہ جوش میں نہیں آتے کیونکہ وہاں پر جوش نہیں ہے۔ وہاں جوش نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں پر تأثر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کیفیت کا پیدا ہونا اللہ کے لئے عیب ہے، کئی لوگ اللہ تعالیٰ کو گالیاں دے رہے ہیں، اور کئی تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کر رہے ہیں، کئی لوگ گناہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے خلاف ہر قسم کی خرافات اور ہر قسم کی بدتمیزی پوری دنیا میں کی جاری ہے۔ جتنی نئی ٹیکنالوجی اور نئی نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں یہ سب کی سب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہی استعمال کی جارہی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے غضب کو جوش نہیں آتا۔ بلکہ ڈھیل دیتے ہیں کہ اور حرام مزے کرلو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ایک حکمت اور مصلحت بنائی ہوئی ہے:

﴿ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾[1]

(اے محمد ﷺ) ان کو ان کے حال پر رہنے دو کہ کھالیں اور فائدے اٹھالیں اور (طول امل) ان کو (دنیا میں) مشغول کئے رہے۔ عنقریب ان کو اسکا (انجام) معلوم ہو جائے گا۔

بہر حال یہ اللہ پاک کا اصول ہے کہ ان کی رحمت ان کے غصے پر غالب ہوتی ہے، اور دنیاومافیہا کی نعمتوں سے آدمی اسی صفت رحمت کے اثر سے مستفید ہوتا ہے۔

انعامات کے ذکر کا مقصد:

اسی طرح سورۂ رحمٰن میں زیادہ تر اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر ہے۔ اور نیک اعمال کی بنیاد پر جنت نعیم کا وعدہ ہے، تاکہ بندوں میں جذبۂ احسان شناسی پیدا ہو، اور احسان شناسی کی وجہ سے شکر کا مزاج بنے اور شکر سے اتباع اور خوشنودی کا جوش پیدا ہو اور پھر اس کے بدلے میں آدمی اللہ تعالیٰ سے مزید نعمتوں کے قابل اپنے آپ کو بنائے۔ یہی اس کا مقصد ہے۔ اسی کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ پاک نے بار بار ارشاد فرمایا:

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾

"تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"؟ اور کہاں تک جھٹلاؤ گے؟۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی نعمتوں کو ہرگز نہیں جھٹلا سکتے، یعنی ایسی کوئی صورت ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے یہ نعمتیں تمہیں مل جائیں، اور تمہاری ضروریات کی تکمیل ہو، اگر تم ہمارے محتاج نہ ہوتے، تم خود ہی آزاد ہوتے، اور خود سے ہی کوئی کام کر لیتے تو کوئی بات ہوتی۔ لیکن نہ تو تم خود آزاد ہو اور نہ تمہارے

---

[1]: الحجر:۳۔

لئے کوئی دوسرے وسائل ہیں کہ جہاں سے تمہیں یہ نعمتیں ملیں، تو پھر ہم سے دوری کیا معنی رکھتی ہے؟ تم کیوں ہم سے بھاگ رہے ہو؟ ہم سے کیوں دور ہوتے ہو؟ یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت ومہربانی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو یاد دلا کر اپنی طرف متوجہ فرمایا۔ کیونکہ انسان کا مزاج ہے: ''اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ'' ''انسان احسان کا بندہ ہوتا ہے۔'' اور بندے پر پروردگار کے لامحدود احسانات ہیں، اس لئے اللہ پاک نے نعمتوں کی یاد دہانی فرمائی کہ ہماری ہزاروں نعمتیں تم پر ہیں، ہزاروں احسان ہم نے تم پر کئے ہیں، اس لئے ہماری طرف آجاؤ۔

عبادت ونافرمانی سے اللہ پاک مستغنی ہیں:

دراصل ہم کو اللہ ربّ العزت کی نعمتوں کا استحضار اور دھیان نہیں ہے۔ اگر ہم اللہ پاک کی نعمتوں کو سوچیں اور اس کا استحضار کریں کہ پروردگار کے ہم پر کتنے انعامات ہیں تو پھر ہمارے اندر اللہ کو راضی کرنے اور اس کی ناراضگی سے بچنے کا جذبہ پیدا ہوگا، اور اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کو خوش کرنے میں ہم کو تکلیف یا مشقت بھی پہونچے تو ہم اس کو بھی گوارا کرلیں گے۔ جب آدمی کو کسی سے محبت ہوتی ہے یا وہ کسی کے احسان تلے دبا رہتا ہے تو پھر اُس کی خوشنودی کے لیے اگر کوئی کلفت برداشت کرنی پڑتی ہے تو وہ اسے بھی برداشت کرلیتا ہے، بلکہ برداشت کرنے میں اسے مزہ آتا ہے، اور پھر یہاں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات بھی سمجھادی ہے کہ اے بندے! میرے لیے جو تکلیف اٹھائیگا اس کا فائدہ بھی تجھے ہی ہونے والا ہے۔ میرا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، پھر بھی بندہ اللہ پاک سے قریب نہیں ہوتا، اگر وہ اللہ پاک کو خوش کرے گا تو اس کو خوش کرنے کی وجہ سے وہ بڑھ نہیں جائیں گے، اور نہ ان کی قدر وعزت میں کوئی اضافہ

ہو گا، اسی طرح اس کے برعکس اگر وہ انہیں ناراض کرے گا تو اس سے ان کی عزت میں کوئی کمی نہیں ہو گی، کیونکہ وہ تو غنی اور حمید ہیں، اس لئے ہماری عبادت اور نافرمانی سے اللہ پاک کی شان میں کوئی اضافہ اور کمی نہیں ہوتی، حدیثِ قدسی ہے:

"يَا عِبَادِيْ لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى أَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْكُمْ مَازَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا"[1]

اللہ پاک نے فرمایا کہ: "اے میرے بندو! اگر تم میں سے اول اور آخر، انسان اور جنات سب کے سب مل کر اتنے فرمانبردار ہو جائیں جیسے سب سے زیادہ متقی آدمی کا دل ہوتا ہے تو اس سے میری شان میں کچھ اضافہ نہیں ہو گا۔ اور پھر آگے فرمایا کہ تمام لوگوں کے دل کسی ایسے آدمی کی طرح ہو جائیں جو سب سے زیادہ فاجر، فاسق اور خبیث ہو تو حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ اس سے میری شان میں کچھ کمی نہیں ہو گی۔ کیونکہ وہ تو غنی ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے عبادت کرنے اور نہ کرنے کی وجہ سے اُن کی شان میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی واقع ہوتی ہے۔

انہیں انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تعلیمِ قرآن محض رحمتِ خداوندی ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾

"وہ رحمٰن ہی ہے، جس نے قرآن کی تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا، (پھر) اس کو گویائی سکھائی"۔

---

[1] صحیح مسلم: ابواب البر والصلة والآداب: باب تحریم الظلم، ۱۹۹۴/۴۔

اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تین کاموں کا ذکر فرمایا ہے، اور یہ تینوں کام سراپا رحمت ہیں، کیونکہ جس وقت اللہ پاک نے قرآن کو نازل کیا اس وقت ساری دنیا کفر و ضلالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، قرآن کو نازل فرما کر اللہ پاک نے ان پر خاص رحم وکرم کا معاملہ کیا اور انہیں اس تاریکی سے نکال کر علم و ہدایت سے روشن اور منور کیا، اور اسی کو بتانے کے لئے اللہ پاک نے صفتِ رحمن کا یہاں ذکر فرمایا۔ کہ میری رحمت ہی کے نتیجے میں تمہیں ایمان کی ہدایت ملی اور قرآن کی تعلیمات سے تم مستفید ہوئے۔

تعلیمِ قرآن کی نسبت حق تعالیٰ نے اپنی جانب کیوں کی؟

اس آیت میں اللہ پاک نے تعلیمِ قرآن کی نسبت اپنی جانب کی ہے،حالانکہ ہم کو قرآن پاک سرکارِ دوعالم ﷺ سے ملا۔ سرکار نے اپنی امت کو قرآن پاک سکھایا، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی اہمیت اور عظمت کو بتانے کے لئے اللہ پاک نے اس کو اپنی جانب منسوب کیا جیسا کہ آگے آرہا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ آپ ﷺ کلام اللہ اور احکامِ شریعت پہونچانے کا ایسا محفوظ واسطہ اور ذریعہ ہیں کہ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اللہ پاک نے اس کو اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ نیز آپ ﷺ کا اللہ پاک سے جو تعلق اور جو محبوبیت تھی اسی بناء پر اللہ پاک نے اس کو اپنی جانب منسوب کیا۔ اور پھر صرف اس امر میں نہیں، بلکہ دوسرے امور میں بھی اپنی جانب نسبت کی ہے، بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے مشرکین کی طرف جو کنکر پھینکے تھے اس کے بارے میں فرمایا:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾[1]

”اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی پھینکی، لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی“

---

[1]: الانفال:۱۷۔

حق تعالیٰ سے غایتِ تعلق کا ثمرہ:

اسی طرح اللہ پاک نے صحابہ کے عمل کو بھی اپنی جانب منسوب کیا، جب جہاد کے دوران صحابہ کرام نے لوگوں کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نے قتل نہیں کیا بلکہ ہم نے قتل کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بندہ اللہ پاک کے ساتھ فنائیت کا تعلق قائم کرلیتا ہے اور اُن کی مرضی کو اپنی مرضی بنالیتا ہے تو پھر اللہ پاک اُس کے ہر کام کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔

”وَلَا يَزَالُ عَبْدِیْ يَتَحَبَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَأَكُوْنَ قَلْبَهُ الَّذِیْ يَعْقِلُ بِہٖ، وَلِسَانَهُ الَّذِیْ يَنْطِقُ بِہٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِیْ يُبْصِرُ بِہٖ، فَإِذَا دَعَانِیْ أَجَبْتُہٗ، وَإِذَا سَأَلَنِیْ أَعْطَيْتُہٗ، وَإِذَا اسْتَنْصَرَنِیْ نَصَرْتُہٗ وَأَحَبُّ عِبَادَةِ عَبْدِیْ إِلَیَّ النَّصِيحَةُ“[۱]

”میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں،“یعنی فرائض کے بعد مزید تعلق کے لیے وہ نوافل کا مسلسل اہتمام کرتا ہے تو پھر میں اُس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں۔ پھر میں اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ سمجھتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے، اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، پھر جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کو قبول کرتا ہوں اور جب وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کو دیتا ہوں اور جب وہ مجھ سے مدد طلب کرتا ہے تو میں اس کی مدد کرتا ہوں، اور میرے بندے کی سب سے محبوب عبادت میرے نزدیک اس کی نصیحت و خیر خواہی ہے۔

۱: معجم کبیر: ۲۲۱/۸۔

علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر کام میں اللہ کی رضا کو مد نظر رکھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کی مرضی اللہ کی مرضی ہو جاتی ہے، اس وجہ سے اللہ پاک اس کے کام کو اپنی جانب منسوب کر دیتے ہیں۔

اسلوبِ قرآنی سے متعلق ایک نکتہ:

ایک اور نکتہ اس موقع پر ذہن میں رکھیں، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے یہاں صفتِ رحمن کیوں ذکر فرمائی؟ کسی اور صفت کا بھی ذکر فرما سکتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک کی ایک عادت مبارکہ ہے کہ جہاں وہ کسی فعل کا حکم فرماتے ہیں یا اپنا کوئی فعل ذکر کرتے ہیں تو جو صفت اس سے مناسبت رکھتی ہے اس کو وہاں ذکر فرماتے ہیں۔ جیسے عبادت کا حکم دے رہے ہیں تو فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾[1]

”اے لوگو! تم اپنے ربّ کی عبادت کرو، کیونکہ وہ تمہارا پالنہار ہے“ یہاں پر اللہ پاک نے لفظِ ”ربّ“ استعمال فرمایا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی اور بھی بہت سی صفات ہیں لیکن یہاں موقع کی مناسبت سے ”ربّ“ استعمال فرمایا۔ کیونکہ عبادت ربوبیت کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک جگہ نگاہوں کو نیچی رکھنے کا حکم دے رہے تو فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾[2]

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے، بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر

---

[1]: البقرۃ:۲۱۔ [2]: النور:۳۰۔

ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔ یہاں اللہ پاک نے صفتِ خبیر کا ذکر فرمایا، کیونکہ یہ صفت اس مقام کے زیادہ مناسب ہے، تاکہ اللہ پاک کے خبر رکھنے اور ان کی بصارت کے استحضار سے وہ بدنگاہی نہ کرسکے۔ ایسے ہی ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾[1]

”وہ (ایسا ہے کہ) آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور ان (باتوں) کو بھی جو سینوں میں پوشیدہ ہیں“

آنکھ کے خیانت کرنے کو وہ جانتے ہیں، اور آنکھ کے خیانت کرنے کے بعد دل میں کیا کچھ ہو رہا ہے، اُس کو بھی جانتے ہیں۔ کیونکہ آنکھ خیانت کرنے کے بعد خاموش نہیں رہتی بلکہ وہ ایک پکچر (picture) لے کر اُسے دل پر چھوڑ دیتی ہے۔ جیسے ہی آنکھ فوٹو لے کر اندر چھوڑتی ہے تو اندر کا نظام حرکت میں آجاتا ہے۔ اور یہ وسوسے اور خیالات آنے لگتے ہیں کہ وہ کتنی خوبصورت ہے؟ اُس کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور اس کی کیا کیا صورتیں ممکن ہیں؟ اس موقع پر اللہ پاک نے صفتِ علم کا ذکر فرمایا، کیونکہ ظاہر ہے کہ آدمی اپنے اندر کیا چھپائے ہوئے ہے اور کیا کیا ارادے کر رہا ہے اس کو تو دیکھا نہیں جاسکتا، اس لئے فرمایا کہ جو تمہارے سینوں میں ہے اس کو بھی میں جانتا ہوں، تاکہ تم اپنے سینے میں غلط باتیں نہ چھپاؤ۔

ایسے ہی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی سزا کا ذکر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ہم نے قوموں کو سزا دی، ہم بڑے انتقام والے ہیں، ہم بڑی سزا دینے والے ہیں، اور ہمارا عذاب بڑا سخت ہوتا ہے۔ ایسے ہی حق تعالیٰ شانہٗ نے سورۂ رحمن کے شروع میں تین باتیں بیان فرمائی ہیں اور یہ تینوں انسان کے لئے رحمت ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمٰن کو ذکر فرمایا کہ یہ تین چیزیں صرف میرے رحم و کرم اور مہربانی کا نتیجہ ہیں۔

---

[1]: غافر: ۱۹۔

سورۂ رحمن اور سورۂ علق میں اسلوب بیان میں فرق:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ ''علق''میں تعلیم اور تخلیق دونوں کو بیان فرمایاہے لیکن وہاں ترتیب الٹی ہے۔ فرمایا:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ،خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ،اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾

پڑھو!اپنے ربّ کے نام سے جس نے پیدا کیا،انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا،اور پڑھو تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے سکھلایا۔

اس میں پیدائش کا ذکر پہلے ہے،اور تعلیم کاذکربعد میں ہے،جبکہ سورۂ رحمٰن میں تعلیم کا ذکر پہلے ہےاورپیدائش کاذکربعد میں ہے۔امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ''عَلَّمَ بِالْقَلَمِ'' میں مطلقاً تعلیم کا ذکر ہے۔(اس میں دنیا کا علم بھی شامل ہے،اور دین کا علم بھی شامل ہے)لیکن سورۂ رحمن میں محض قرآن پاک کی تعلیم کا ذکر ہے، چونکہ سورۂ علق میں دونوں علوم شامل ہیں،اور دنیا کی تعلیم اگرچہ وہ بھی نعمت ہے لیکن انسان کی پیدائش سے بڑی نعمت نہیں ہے،اس لئے وہاں پہلے تخلیق کی نعمت کاذکر فرمایا،اور سورۂ رحمن میں محض قرآن پاک کی تعلیم کا ذکر ہے، اور وہ ایسی نعمت ہے جو انسان کی پیدائش پر بھی مقدم ہے۔اس لئے اس سورہ میں پہلے اس نعمت کوذکرکیا،اس کے بعد تخلیق کوذکرکیا۔[1]

تعلیم کو تخلیق پر مقدم کرنے کی غرض:

علماء نے فرمایاہے کہ اللہ پاک نے انسان کی پیدائش پر تعلیم قرآن کو مقدم کیا،پہلے ''عَلَّمَ الْقُرْآنَ'' کہا،اس کے بعد ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ''کہا، حالانکہ پہلے آدمی پیدا ہوتاہے، پھر بعد میں قرآن پاک کی تعلیم اسے دی جاتی ہے۔

---

[1]: تفسیرِ رازی:۱۵/۵۱۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ دراصل اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ آدمی کی پیدائش کی اصل غرض تعلیمِ قرآن ہے، اور تعلیمِ قرآن ہی تخلیق کے مقابلہ میں اہم اور عظیم نعمت ہے، اس وجہ سے تعلیم کو مقدم کیا گیا، کیونکہ ''غرض'' ''ذی غرض'' سے مقدم ہوتی ہے۔[1] اور اسی وجہ سے اس کو پیدا کیا گیا ہے، کیونکہ اگر اس نے قرآن کی تعلیم حاصل نہ کی ہو تو اس کا پیدا ہونا بے کار اور بے فائدہ ہے، انسان کی پیدائش کے علاوہ اللہ پاک نے دنیا کی اور بھی بہت سی نعمتوں کا ذکر فرمایا، لیکن ان سب پر تعلیمِ قرآن کو مقدم کیا، اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی نعمتیں اسی وقت نعمت بنتی ہیں جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے احکام کے مطابق تصرف میں لائی جائیں۔ چاہے دنیا کی بڑی نعمت ہو یا چھوٹی نعمت، اگر اس نعمت کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق استعمال نہیں کیا جائے گا تو وہ نعمت نہیں بلکہ وبالِ جان اور عذاب بن جائے گی، لیکن اس نعمت کو مرضیِ الٰہی کے مطابق استعمال کرنا موقوف ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے معلوم ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کا معلوم ہونا موقوف ہے قرآن پاک کی تعلیم پر، اس لئے ساری نعمتوں میں سب سے اہم، سب سے افضل، سب سے بڑی اور سب سے ضروری نعمت قرآن پاک ہی کی تعلیم ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک کی تعلیم کو مقدم کیا اور اشارہ کر دیا کہ تمہارے لئے سب سے ضروری اور اہم یہی ہے، اس کو تم حاصل کرو۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ:

انسان اُسی وقت انسان ہوتا ہے جب وہ قرآن کی تعلیم سے آراستہ ہو، اور اگر کوئی انسان قرآن کی تعلیم سے آراستہ نہ ہو تو پھر وہ انسان نہیں رہتا۔ بلکہ انسان کا لقب اور انسان کا غلاف رہ جاتا ہے۔ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

---

[1] تفسیرِ رازی: ۱۵/ ۵۱ و روح المعانی۔

کہ تم جس انسان کو دیکھتے ہو وہ انسان نہیں، بلکہ وہ انسان کا غلاف ہے۔ انسان تو اس غلاف کے اندر ہوتا ہے۔ اگر وہ قرآن کی تعلیم سے آراستہ ہے تب تو وہ انسان کہلانے کے قابل ہے اوراگر وہ قرآن کی تعلیم سے آراستہ نہیں ہے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ وہ ایک انسانی ڈھانچہ اور انسان کا غلاف ہے۔

اگر کوئی انسان قرآن پاک کے مطابق زندگی نہیں گزارتا ہے تو اس میں انسانیت تو دور کی بات ہے وہ جانوروں سے بھی بدتر ہو جائے گا، کیونکہ انسانوں کو اعمالِ بد کے نتیجے میں عذاب دیا جائے گا، لیکن جانوروں کے لیے سزا کا کوئی نظام نہیں ہے، صرف عدل کا نظام ہے۔ کل قیامت کے دن جانوروں کو بھی زندہ کیا جائے گا اور دنیا میں جن جانوروں میں آپس میں ظلم ہوا ہو گا اُن کا قصاص دلوایا جائے گا۔

قیامت میں جانوروں کے ساتھ بھی انصاف ہو گا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سینگ والی بکری نے کسی بے سینگ والی بکری کو مار دیا تو اللہ تعالیٰ کل قیامت میں اس کو سینگ لگوادیں گے، اور وہ اپنا بدلہ لے لیگی۔ وہاں اللہ عزوجل میزانِ عدل قائم فرمائیں گے اور ایسا انصاف ہو گا کہ بال کی کھال نکالی جائے گی۔ کسی کا بھی ذرا برابر کوئی حق باقی نہیں رہے گا۔ لیکن جانوروں کے لئے جزا اور سزا کا نظام نہیں رہے گا۔ البتہ ان کے ظلم کا بدلہ دلوانے کے بعد اللہ عزوجل ان سے فرمائیں گے کہ: ”كُوْنوا تُرَابًا، فَتَكُوْنُ تُرَابًا فَيَرَاهَا الْكَافِرُ فَيَقُوْلُ: يَالَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا۔“[1]

تو مٹی ہو جا، تو وہ مٹی ہو جائے گی۔ کافر جب اس کو دیکھے گا تو تمنا کرنے لگے گا کہ کاش میں بھی مٹی ہوتا۔

---

[1]: مستدرکِ حاکم: کتاب الاھوال: ۴/۶۱۹۔

لیکن انسان کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ جس نے قرآن پاک کے مطابق اپنی زندگی نہیں گزاری تو اُس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار رکھنا چاہئے، اُن نعمتوں میں سب سے پہلے قرآن پاک کی تعلیم ہے، آدمی خود بھی قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرے۔ اور اپنے بچوں کو بھی قرآن پاک کی تعلیم دلوائے۔ اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ پھر اُس کے مطابق عمل کرے۔ اور پھر اللہ کے ہاں دائمی عیش حاصل کرے۔

تعلیمِ قرآن سے مراد:

تعلیم قرآن سے صرف اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کی تلاوت کرنا بھی مراد ہے، جیسا کہ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:[۱]

اسی وجہ سے اس کا پڑھنا بھی نعمت ہے، اس کا سمجھنا بھی نعمت ہے، اس پر عمل کرنا بھی نعمت ہے، اس کے مطابق تربیت حاصل کرنا بھی نعمت ہے، اس کی تبلیغ کرنا بھی نعمت ہے، اس کی دعوت دینا بھی نعمت ہے، اس کی ہر چیز نعمت ہی نعمت ہے۔

تلاوتِ قرآن سے متعلق شیطانی دھوکہ:

قرآن پاک کی تلاوت کا بھی بڑا اہتمام کرنا چاہیے۔ محض قرآن پاک کی تلاوت بھی بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے، ایک ہے قرآن پاک کی تلاوت اور ایک ہے اس کو سمجھنا۔ عام طور پر تلاوتِ قرآن پاک سے دور کرنے کے لیے شیطان ایک تدبیر یہ اختیار کرتا ہے کہ آدمی کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اس کو بغیر سمجھے پڑھنے سے کیا فائدہ؟ اس طرح آدمی تلاوت سے محروم ہو جاتا ہے، یا کبھی تلاوت کے بجائے اس کے

---

[۱]: تفسیر ابن کثیر: ۷/۴۸۹ و تفسیر خازن: ۶/۲۲۔

ترجمہ کی طرف مائل کرتا ہے، جب آدمی ترجمے سے پڑھتا ہے تو ایک یا دو رکوع پڑھ کر تھک جاتا ہے، اگر یہ بغیر ترجمے کے پڑھتا تو پھر پاؤ پارہ یا آدھا پارہ پڑھ لیتا، لیکن ترجمہ پڑھنے کی وجہ سے اکتا کر جلد ہی اس کو بند کر دیتا ہے، نہ صحیح طور پر تلاوت کر پاتا ہے اور نہ ترجمہ پڑھ پاتا ہے۔

تلاوتِ قرآن کے بارے میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول:

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہفتے میں ایک قرآن پاک کو مکمل کرلیا کرتے تھے۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا۔ قرآن پاک کی سات منزلیں مقرر کرنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ سات دن میں قرآن پاک مکمل کرلیتے تھے، ہر دن ایک منزل پڑھتے، ساتویں دن ان کا قرآن پاک مکمل ہو جاتا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تو قرآن پاک سمجھے ہوئے تھے، پھر ہر ہفتے قرآن پاک کیوں ختم کیا کرتے تھے؟ کیونکہ قرآن پاک کی مستقل تلاوت بھی مطلوب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام:

خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت کا بڑا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ آپ مکمل حافظ بھی تھے اور پورے قرآن پاک کو سمجھے ہوئے بھی تھے، لیکن پھر بھی آپ ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہو گیا، ایک ہی رکعت میں آپ نے سورۂ بقرہ پڑھی، سورۂ آل عمران بھی پڑھی، سورۂ نساء بھی پڑھی۔[۱] اور سورۂ مائدہ تک پہنچ گئے۔

---

[۱] صحیح مسلم: صلاۃ المسافرین: باب استحباب تطویل القراءۃ فی الصلاۃ، ۱۸۵۰۔

حضور ﷺ کا قرآن پاک سننا:

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضور پاک ﷺ نے مجھ سے فرمایا: "تم مجھے قرآن پاک سناؤ۔" حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "أَقْرَأُ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ أُنْزِلَ" میں قرآن پاک آپ کو سناؤں؟ حالانکہ وہ آپ ہی پر اُترا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ: "ہاں میں چاہتا ہوں کہ میں سنوں"

آپ ﷺ کو کلام اللہ سے اتنا عشق تھا کہ تلاوت تو کرتے ہی تھے، لیکن سننے میں بھی مزہ آتا تھا، بلکہ سننے میں پڑھنے سے زیادہ یکسوئی ہوتی ہے اور جتنی زیادہ یکسوئی ہوتی ہے آدمی اتنا ہی متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو تلاوت کا حکم دیا، آپ نے سورۂ نساء پڑھنی شروع کی اور سورۂ نساء پڑھتے پڑھتے اس آیت پر پہنچے:

"فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا" (۴۱)

"سو اس وقت بھی کیا حال ہو گا جبکہ ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے حاضر کرینگے"

آپ نے جب اس آیت کو سنا تو فرمایا: "بس! بس!" جب حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو آپ کی آنکھ مبارک سے آنسو چھلک رہے تھے۔[1]

قرآن سے آپ کو اتنا لگاؤ تھا، اتنا تعلق تھا، کہ آپ بکثرت اسے پڑھتے بھی تھے اور صحابہؓ کرام سے سنتے بھی تھے۔

میرے دوستو! تلاوت کرو! قرآن پاک کی تلاوت بھی خود مقصود ہے۔ قرآن پاک کو "قرآن" اس لیے بھی کہتے ہیں کہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور اس کو پڑھا جاتا ہے۔

---

[1]: صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن: باب قول القاری للمقری حسبک، ۵۰۵۰۔

تلاوت میں مشغول آدمی کی اللہ کے ہاں اہمیت:

ایک حدیث میں ہے: ”مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِي وَمَسْأَلَتِي أَعْطَيْتُهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِي السَّائِلِينَ“[۱]

جس آدمی کو قرآن پاک کی تلاوت نے اتنا مشغول کر دیا ہو کہ اُسے میرا ذکر کرنے اور مجھ سے مانگنے کی فرصت نہ ملے تو میں اسے اس سے زیادہ دوں گا جو مانگنے والوں کو دیا جاتا ہے۔

تلاوت نہ کرنے والا ویران گھر کی طرح ہے:

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”اِنَّ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِهٖ شَیْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ كَالْبَیْتِ الْخَرِبِ“[۲]

بے شک وہ آدمی جس کے پیٹ میں قرآن پاک میں سے کچھ بھی نہ ہو تو وہ ویران گھر کی طرح ہے۔

اس ملک میں اس مضمون پر زیادہ توجہ دینے کی اس لیے ضرورت ہے کہ لوگوں کے ذہن میں ایک شیطانی وسوسہ یہ آگیا ہے کہ جب ہم سمجھتے نہیں ہیں تو پھر پڑھنے کا کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر سمجھے پڑھنا بھی عبادت اور باعثِ اجر و ثواب ہے۔

قرآن مجید کے ایک حرف پڑھنے پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں:

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللهِ فَلَهٗ بِهٖ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا لَا اَقُوْلُ الٓمٓ حَرْفٌ وَلٰكِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ“[۳]

جو آدمی کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھتا ہے تو اس کے لئے ایک حسنہ ہوتی ہے، اور ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے، میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ الم ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔

---

[۱] سنن ترمذی: ابواب فضائل القرآن: باب من شغلہ القرآن عن ذکری، ۳۱۷۶۔ [۲] سنن ترمذی: ابواب فضائل القرآن: باب الذی لیس فی جوفہ شئ، ۳۱۶۱۔ [۳] سنن ترمذی: فضائل القرآن: باب ماجاء فیمن قرأ حرفا من القرآن، ۱۷۵۔

ہمیں یہاں ایک گھنٹہ کام کرنے پر دس ڈالر ملتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ ایک حرف پر دس نیکیاں دے رہے ہیں، حالانکہ ایک نیکی کو ایک ڈالر کے برابر تصور کرنا یہ نیکی کو ڈی گریڈ (degrade) کرنے کے مترادف ہے، ڈالر، روپیہ، یان وغیرہ کرنسی کا نام ہے، یہ کرنسی حسنہ کے برابر نہیں ہوسکتی۔

قرآن پاک آنکھوں کی عبادت کا حصہ ہے:

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی آنکھوں کو اُن کی عبادت کا حصہ دیا کرو، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! آنکھوں کو اُن کا حصہ دینے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ''قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کرو۔''

ہم یہاں ایک نہیں بلکہ دو دو، تین تین اور پانچ پانچ گھنٹے بیٹھے ہوئے آنکھوں کو ٹی وی، گیمس اور ویڈیو وغیرہ میں مشغول کرکے گنہگار بناتے ہیں، اور کچھ تھکان اور اکتاہٹ ہمیں محسوس نہیں ہوتی، لیکن اگر آدھا گھنٹہ قرآن پاک پڑھ لیں تو اس سے اکتا جائیں گے، تھکان ہو جائے گی، طبیعت بور ہو جائے گی، حالانکہ قرآن پاک تو دل لگانے اور طبیعت کو بہلانے کی چیز ہے، ہم یہ گیمز اور ٹی وی پروگرام اسی لیے دیکھتے ہیں کہ ہمارا غم دور ہو جائے، کچھ مزہ آجائے، طبیعت لگ جائے، اس طرح ہم اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہیں اور بسا اوقات گناہ میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن اللہ پاک فرمارہے ہیں کہ ایک ایمان والے کے لیے قرآن پاک میں یہ سارے فائدے ہیں۔ اس کو پڑھے تو سارے غم دور ہو جائیں گے، طبیعت میں نشاط آجائے گا، اور پھر گناہ کے بجائے ثواب بھی ملے گا۔

قلب کی بہار اور غم سے نجات کا ذریعہ:

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی بندہ کسی غم یا مصیبت میں یہ کلمات کہتا ہے تو اللہ پاک اس کے غم کو دور کر دیتے ہیں، اور اس کو حزن اور مصیبت کے بدلے خوشی عطا فرماتے ہیں، وہ کلمات یہ ہیں:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ عَبْدُكَ وَابْنُ أَمَتِكَ ، نَاصِيَتِيْ فِيْ يَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ ، أَوْ أَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ ، أَوْ عَلَّمْتَهٗ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ ، أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ" أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ، وَجِلَاءَ حُزْنِيْ ، وَذَهَابَ هَمِّيْ ، إِلَّا أَذْهَبَ اللّٰهُ هَمَّهٗ، وَأَبْدَلَهٗ مَكَانَ حُزْنِهٖ فَرَحًا"[1]

"اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں، اور تیری باندی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیرے قبضہ میں ہے، تیرا حکم مجھ میں جاری وساری ہے، تیرا فیصلہ مجھ میں برابر ہے، میں تجھ سے ہر ایسے اسم کا حوالہ دیکر سوال کرتا ہوں جو کہ تیرا ہے اور تو نے اپنے لئے اس کو رکھا ہے، یا اس کو تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے، یا تو نے اسے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یا اپنے علمِ غیب میں تو نے اس کو ترجیح دی ہے کہ قرآن پاک کو میرے قلب کی بہار بنادے، میرے غم کے جلاء کا اس کو ذریعہ بنادے، میرے فکر کے دور ہونے کا اس کو ذریعہ بنادے"

قرآن پاک سے روکنے والے موجودہ دور کے ہتھکنڈے:

ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ٹی وی اور اس پر چلنے والے پروگرام، ویڈیو گیمز، وغیرہ دراصل قرآن پاک سے روکنے کا ایک نظام ہے، اور اس کی نظیر آپ ﷺ کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ جب آپ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تو ایک آدمی قصے کہانیوں کی کتاب لاتا اور لوگوں کو سناتا، تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو قرآن سے پھیر دے، اسی کا ذکر کرتے ہوئے اللہ پاک فرماتے ہیں:

---

[1] مستدرک حاکم: کتاب الدعاء والتکبیر والتھلیل والتسبیح والذکر، ۱۸۷۷۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا﴾ [1]

"اور بعضا آدمی (ایسا) بھی ہے جو ان باتوں کا خریدار بنتا ہے، جو اللہ سے غافل کرنے والی ہیں تا کہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کر لے اور اس کی ہنسی اڑا دے ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

بعض تو کہتے تھے کہ اس قرآن کو سنو ہی مت بلکہ اس کے بیچ میں شور مچا دیا کرو، تا کہ تم غالب رہو۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ [2]

اس طرح زمانۂ نبوت میں بھی قرآن کے خلاف ہتھکنڈے تیار کئے جاتے تھے، اور لوگوں کو اس سے روکا جاتا تھا، آج کے زمانہ کے یہ ہتھکنڈے ہیں، لوگوں کو اس طرح قرآن پاک سے روکا جارہاہے اور دور کیا جارہاہے، یہ اس کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ اللہ پاک ہم کو اس سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

ترکِ قرآن پر قیامت میں رسول کی شکایت:

اگر آج ہم نے اس کو چھوڑ دیا اور بیان کی نعمت کا صحیح استعمال نہیں کیا تو کل کے دن یہی ہمارے لئے وبالِ جان ہو گا، قرآن بھی اللہ سے شکایت کرے گا اور رسول بھی اللہ سے شکایت کریں گے، اور یہ بات قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ [3]

"رسول کہیں گے کہ اے پروردگار! میری قوم اس قرآن کو بالکل چھوڑ بیٹھی تھی"

۱: لقمان:۶۔ ۲: فصلت:۲۶۔ ۳: الفرقان:۳۰۔

یہ سارا وبال اسی کا ہے۔ اگر یہ قرآن پاک کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوتے اور اس کی تعلیمات کو اپنائے ہوئے ہوتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا جو یہ بُرے بُرے احوال میں اب پھنسے ہوئے ہیں۔ رسول ہماری شفاعت کرنے کے بجائے کہیں شکایت نہ کردیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے ڈرنے کا یہ مقام ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی صفتِ رحمت کے ضمن میں جس تعلیمِ قرآن کا ذکر کیا ہے، اس میں تلاوت قرآن بھی داخل ہے، اس لئے اس کی تلاوت بھی ضروری ہے اور سیکھ کر اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

بات اس مضمون پر کافی طویل ہوگئی، لیکن یہاں کے ماحول کے اعتبار سے اس کی طوالت ہی مناسب تھی، اس وجہ سے اس کا ذکر تفصیلاً کیا گیا۔

نعمتِ تخلیق:

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ﴾ ”اسی نے انسان کو پیدا کیا“۔

اللہ پاک کی ایک بڑی نعمت انسان کی تخلیق ہے، اگر وہ انسان کو پیدا نہ کرتا تو انسان عدم میں پڑا رہتا۔ نہ دنیا دیکھتا، نہ دنیا کے رنگ و بو سے واقف ہوتا، اور نہ آخرت کی نعمتوں سے مزے کرپاتا۔

انسان سے کون مراد ہیں:

”اَلْإِنْسَانَ“ کی تفسیر میں بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں، کیونکہ وہ پہلے آدمی ہیں جنہیں اللہ پاک نے بنایا، پھر اُس کے بعد ان سے سلسلہ چلایا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، کیونکہ یہاں قرآن پاک کے نازل ہونے کا بیان ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سارے انسان مراد ہیں۔[۱] کیونکہ یہاں

۱: تفسیر طبری: ۲۲/۷۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی نعمتوں کو بیان فرمارہے ہیں اور نعمتوں میں سارے انسان شامل ہیں، اس لئے سب انسان ہی یہاں مراد ہیں، بہر حال انسان کی تخلیق اور اس کے وجود کی نعمت کا ذکر فرمایا پھر اس وجود کے بعد اعضاء سے نوازا، اگر اللہ پاک ہم کو پیدا کرتے لیکن اس کے اندر نقص رکھ دیتے مثلا ہمیں آنکھیں نہ دیتے، زبان نہ دیتے، یا ہم ہاتھ پیر سے معذور ہوتے تو ہم کیا کرتے؟ ہمیں اُن سے شکایت کا کوئی حق نہیں ہے، کوئی اُن پر مقدمہ نہیں کر سکتا، اس لئے اللہ پاک نے اس عظیم نعمت کی یاددہانی فرمائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر مزید ایک اور نعمت سے نوازا اور قرآن پاک نازل فرمایا، چونکہ اس علم کے ذریعے زندگی گزارنے اور دارین میں کامیابی اور رضاء الٰہی کے حصول کا طریقہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس کے اظہار کے واسطے بیان کی صلاحیت عطا فرمائی۔

قوتِ گویائی بھی عظیم نعمت ہے:

اور فرمایا: "عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" ، "اسی نے اُس کو گویائی سکھلائی"

قوت گویائی بھی بہت بڑی نعمت ہے، اللہ پاک نے بے شمار مخلوقات بنائی ہیں لیکن ما فی الضمیر کے اظہار کی جو صلاحیت انسان کو عطا کی گئی ہے وہ کسی اور کو نہیں دی گئی، آج ہم دین اور دنیا کے جتنے علوم سیکھتے اور سکھاتے ہیں وہ سب اسی قوتِ گویائی کا نتیجہ ہیں۔

بیان سے کیا مراد ہے؟

"عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ بیان دو قسم کا ہوتا ہے:

(۱) "بیان بالتحریر" یعنی تحریر اور کتابت کی شکل میں بات سمجھانا، جس کا سورۂ علق میں تذکرہ ہے: "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ"، "وہ ایسا ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی"۔

اس کا طریقہ پہلے زمانہ میں کچھ اور تھا، آج کے زمانہ میں کچھ اور۔ پہلے قلم کی نوعیت الگ تھی، اور آج الگ ہے، روشنائی بنائی جاتی تھی، اور اس میں ڈبو کر لکھا جاتا تھا، پھر ریفل کی شکل بنی، یا پھر روشنائی خود قلم میں ڈالنے کی شکل بنی، بار بار ڈبونے کی جھنجھٹ ختم ہوئی، آج زمانہ اور ترقی کر گیا تو کمپوزنگ کی سہولت ہوئی، اور ترقی ہوئی تو کمپوز کرنے کے لئے ہاتھ کے حرکت کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی، بلکہ آج ایسے سافٹ ویرس بھی ایجاد کئے گئے ہیں کہ آدمی اپنی زبان سے الفاظ ادا کرتا ہے تو کمپیوٹر اسے کمپوز کر لیتا ہے، الفاظ یہاں سے نکلتے ہیں اور وہاں لکھا جاتا ہے۔

(۲) بیان کی دوسری قسم ”بیان بالتقریر“ ہے، یعنی زبان کے ذریعے قرآن پاک کے احکام و مسائل کا اظہار کرنا۔ مافی الضمیر کا اظہار چاہے زبان کے ذریعے ہو یا لکھنے کے ذریعے ہو، دونوں اس میں داخل ہیں۔[۱]

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں بیان سے مراد حلال اور حرام ہے، بعض کہتے ہیں کہ خیر و شر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ہدایت اور ضلالت کا راستہ مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نفع اور ضرر مراد ہے۔[۲]

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تقریر و تحریر افہام و تفہیم کے جتنے ذرائع ہیں وہ سب بیان کے مفہوم میں داخل ہیں۔[۳]

تفسیر مظہری میں ”بیان“ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سات لاکھ زبانیں سکھلائیں۔ ان میں سب سے افضل عربی زبان ہے۔[۴] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ زبانیں کیسے انہیں یاد تھیں؟ اس کا جواب آج کے زمانہ میں آسان

۱: تفسیرِ مظہری: ۱/ ۶۲۸۳۔ ۲: روح المعانی: ۲۰/ ۱۱۳، تفسیر قرطبی: ۱۷/ ۱۳۴۔
۳: تفسیر بغوی: ۷/ ۴۳۸۔ ۴: تفسیر مظہری: ۱/ ۳۷۴۹۔

ہے، کیونکہ آج کے سی ڈیز، کمپیوٹرز اور ہارڈ ڈسک میں لاکھوں چیزیں سماتی ہیں، کیا آپ ایک سی ڈی میں سات لاکھ چیزیں نہیں ڈال سکتے؟ آرام سے ڈال سکتے ہیں! بلکہ اب تو ایسی ایسی ہارڈ ڈسک وغیرہ آگئی ہیں کہ پوری دنیا کے لوگوں کے نام، اُن کے ایڈریس اور فون نمبرس سب کچھ ایک ہی ڈسک میں ڈالا جاسکتا ہے۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ تو قادر مطلق ہیں، وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔

قوت گویائی کا مقصد تعلیمِ قرآن ہے:

یہاں اللہ پاک نے تعلیمِ قرآن کے ساتھ قوت گویائی کا ذکر فرمایا، اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ قوت گویائی آدمی کو اسی لئے دی گئی تاکہ وہ قرآن پاک کی تعلیم دے سکے۔ اس کو سیکھ سکے اور دوسروں کو سکھا سکے، اس کے دیگر مقاصد تو ہیں ہی، لیکن ایک اہم مقصد یہ بھی ہے۔ اگر اللہ پاک ہم کو یہ نعمت عطا نہ فرماتے تو ہم گویا دین ہی سے محروم رہتے۔

ایک نکتہ:

علماء نے یہاں ایک اور نکتہ بیان فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تعلیمِ قرآن کو پہلے ذکر کیا، اور قوتِ بیان کو بعد میں ذکر کیا۔ اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ وہی بیان قابل قبول ہوگا جو قرآن پاک کی تعلیمات پر مشتمل ہو۔ اگر کسی کے بیان میں شریعت کی حدود اور تعلیمات کا لحاظ نہ ہو تو وہ بیان، بیان نہیں بلکہ وبالِ جان ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امت میں جو فتنے پیش آئیں گے اُن میں سے ایک فتنہ یہ بھی ہوگا:

"كَيْفَ بِكُمْ إِذَا رَأَيْتُمُ الْمُنْكَرَ مَعْرُوفًا وَالْمَعْرُوفَ مُنْكَرًا"[1]

"تمہارا کیا حال ہوگا؟ جب تم منکر کو معروف اور معروف کو منکر سمجھوگے" کہ جائز اور بھلی باتوں سے روکا جانے لگے گا، اور ناجائز امور اور منکرات کی ترغیب دی جانے

---

[1]: مسند ابویعلیٰ: شہر بن حوشب عن ابی ھریرۃ: ۶۴۲۰۔

لگے گی، اس پر بیانات و تقاریر ہوں گی، لوگوں کو آمادہ کیا جائے گا، اور گمراہی پھیلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ یہ میری نعمت کی ناشکری ہے کہ میں نے قوتِ بیان گمراہی پھیلانے کے لئے نہیں دی، بلکہ قرآن پاک کی تعلیم کو عام کرنے اور اس کی صحیح تشریح کرنے اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے دی ہے۔

سورج اور چاند کا نظام:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴿۵﴾

”سورج اور چاند ایک حساب میں جکڑے ہوئے ہیں“

اسی کے ذریعہ اوقات کا تغیر، ماہ و سال، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ کی مدت اور وقت متعین ہوتا ہے، یہ یوں ہی بے کار پڑے ہوئے نہیں ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے چار ایسی نعمتوں کا بیان فرمایا ہے جو باطنی اور اصلی ہیں، ان کا فوری طور پر کسی آدمی کے سمجھ میں آنا ضروری نہیں، اس کے لیے ذہن اور عقل چاہیے۔ پھر اس کے بعد ایسی نعمتوں کا ذکر فرمایا جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی دقیق اور باریک بات بتائی جاتی ہے تو اس بات کو اس کا ذہن قبول نہیں کرتا، اس کو سمجھانے کے لئے موٹی بات بتائی جاتی ہے، جس سے اس گہری اور دقیق بات کو سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ جیسے سورج اور چاند کا نعمت ہونا سب پر ظاہر ہے، روزانہ سورج نکلتا ہے وہ اپنے مدار پر گھومتا ہے اور زمین اپنے مدار پر اسطرح گھومتی ہے کہ زمین کے سب حصوں پر سورج کی کرنیں اور دھوپ پڑتی ہے، موسموں اور رات و دن کا نظام اسی سے چلتا ہے، اور اسی کی وجہ سے ہم اور ہمارا نظام باقی ہے، لیکن اس کے بالمقابل قرآن پاک کی نعمت کو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا، حالانکہ وہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے سامنے دوسری چیزوں کی کوئی حیثیت

نہیں، لیکن آدمی کو اس کے نعمت ہونے کا احساس ہی نہیں۔ اس لئے اللہ پاک نے یہاں پہلے قرآن کی نعمت کو ذکر فرمایا، اس کے بعد چاند اور سورج کا ذکر کیا، تاکہ اس کے بھی نعمت خداوندی ہونے کا احساس دلوں میں پیدا ہو۔

سورج کی حقیقت:

سورج اللہ پاک کی اتنی عظیم اور بڑی نعمت ہے کہ ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے، وہ اتنا بڑا ہے کہ اگر اس کو کھوکھلا کر کے اُس کے اندر زمین ڈالی جائے تو دس لاکھ سے زائد زمینیں اُس میں سما سکیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں اُس سے متعلق نئی نئی چیزیں دریافت ہو رہی ہیں، ایک کتاب میں لکھا تھا غالباً ۸۹ء میں جب دُور بینوں کے ذریعے سورج کو دیکھا گیا تو اس کے اندر سے دو شعلے دو الگ الگ جگہوں سے نکل رہے ہیں، جیسے تنور اور چولہے سے شعلے نکلتے ہیں۔ اور وہ شعلے ڈھائی لاکھ میل دور جا رہے ہیں، اس دنیا میں اگر کوئی صرف سو فٹ کا فوارہ بنادے تو دنیا اسے دیکھنے جاتی ہے۔ اور وہ دو جگہوں سے نکلے والے دونوں شعلے آگے جا کر آپس میں مل رہے ہیں، اور ان دونوں شعلوں کے مابین چار لاکھ میل کی مسافت ہے۔ چار لاکھ میل کی مسافت سے دو شعلے سورج سے نکلے اور ڈھائی لاکھ میل دُور جا کر یہ دونوں آپس میں مل گئے۔ یہ اللہ پاک کی کیسی قدرت ہے؟ اس طرح کی قدرتوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہے:

”سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ“[1]

ہم انہیں اپنی نشانیاں کائنات میں بھی دکھائیں گے، اور خود ان کے اپنے وجود میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل کر آجائے کہ یہی حق ہے۔

---

[1] فصلت: ۵۳۔

سورج کے چند دنیوی فوائد:

قرآن پاک میں اور جگہوں پر بھی سورج کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اس وجہ سے کہ اس کے بارے میں حق تعالیٰ کے نظامِ قدرت پر غور و فکر کیا جائے کہ وہ کتنا بڑا ہے؟ اور کیسے معلق ہے کہ اس کے نیچے کوئی پلر بھی نہیں ہے۔

اور پھر یہ ہمارے اور نظامِ کائنات کے لئے کتنا ضروری ہے؟ آج کے دور میں یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں ہے، اگر نظامِ شمسی نہ ہوتا تو کسی انسان کے لیے یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ وہ اس دنیا میں زندہ رہتا۔ اس کا قرب اور بعد بھی ایک حساب سے ہے، اگر وہ ہمارے قریب آجائے یا اپنے مدار سے پیچھے ہٹ جائے تو ہم زندہ نہ رہ سکیں۔ ہماری پوری زندگی کا نظام اسی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

رات اور دن کا آنا جانا، ان کا چھوٹا اور بڑا ہونا، موسمِ بہار و برسات کا آنا، ان کا سرد اور گرم ہونا، غلوں کا اُگنا، پھلوں کا نکلنا، اس میں رَس کا آنا، وقت پر پکنا، ہر پھل کا اپنا اپنا ذائقہ لینا، فصلوں کا کٹنا، اور ان میں انقلابات کا ہونا، اور ابتداء تا انتہاء مکمل مراحل سے گزر کر صحیح و سالم رہنا، سب سورج ہی کی گردش کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اور سوائے حق تعالیٰ کے کوئی اور ذات نہیں جو ان نظاموں کو چلائے۔

ایک لقمہ کے پیچھے خدائی نظام:

آدمی تو صرف گروسری (Grocery) اسٹور پر جاکر کچھ پیسے دیکر سامان اور غلہ خرید لاتا ہے، لیکن کبھی یہ نہیں سوچتا کہ یہ اللہ پاک کی کتنی بڑی نعمت ہے؟ اور اس ایک لقمہ کے پیچھے حق تعالیٰ نے کیا نظام چلایا ہے؟ اور وہ کتنے مراحل سے گزر کر ہمارے ہاتھ میں آیا ہے؟ اس کے پیچھے سورج کا نظام ہوتا ہے، چاند کا نظام ہوتا ہے،

بادلوں کا نظام ہوتا ہے، بارش کا نظام ہوتا ہے، ہواؤں کا نظام ہوتا ہے، زمین کا نظام ہوتا ہے، کسان اس میں کام کرتا ہے، مزدور اس میں کام کرتے ہیں، اس کے بعد بیج کی حفاظت کا مرحلہ ہوتا ہے، جب فصل آتی ہے تو فصل کے کاٹنے کا نظام ہوتا ہے، پھر اس کے بازاروں میں لے جانے کا نظام ہوتا ہے، پھر بازاروں اور دکانوں سے ہمارے ہاتھوں تک پہونچنے کا نظام ہوتا ہے، اوراگر صرف غلہ لیا گیاہے تواُس کے پسانے اور پکانے کا نظام ہوتا ہے۔ ان تمام مراحل اور سینکڑوں واسطوں سے گزر کر ایک لقمہ ہمارے کھانے کے قابل ہوتا ہے، اور ہمیں اس کی قدر نہیں ہوتی، اس لیے اللہ تعالیٰ کو یہ بات بالکل گوارا نہیں ہے کہ اگر لقمہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو اُس کو چھوڑ دیا جائے۔ ہمارے لیے تو ایک لقمہ ہے لیکن اس ایک لقمہ کے لئے ساری کائنات کا نظام چلایا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کا نعمت کی تعظیم کرنا:

اسی وجہ سے حضور پاک ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں یہ بات آتی ہے کہ:

”یُعَظِّمُ النِّعْمَةَ، وَإِنْ دَقَّتْ“[1]

آپ نعمت کی بڑی تعظیم فرماتے تھے چاہے وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

جب آپ ﷺ کھاتے تو اس طرح کھاتے جیسے آپ غلام ہیں، ایک حدیث میں ہے:

”آکُلُ کَمَا یَاکُلُ الْعَبْدُ وَاَجْلِسُ کَمَا یَجْلِسُ الْعَبْدُ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدٌ“[2]

”میں تو ایسے کھاتا ہوں جیسے غلام کھاتا ہے اور میں ایسے بیٹھتا ہوں جیسے غلام بیٹھتا ہے، کیونکہ میں غلام ہوں“

---

[1] المعجم الکبیر: من اسمہ ہند، ۲۲-۱۵۶۔ [2] شعب الایمان للبیہقی: باب فی المطاعم والمشارب، ۵۹۷۵۔

آپ ﷺ دوزانو بیٹھ کر یا اُکڑوں بیٹھ کر کھاتے، اور کھاتے ہوئے ٹیک نہیں لگاتے۔ عاجزی اور انکساری کی ہیئت اختیار کر کے کھاتے۔

کھاتے وقت نہ کھانے کو اپنے سے نیچے رکھتے اور نہ اپنے سے اوپر رکھتے۔ بلکہ دونوں کی سطح ایک رکھتے۔ اور یہ سب کھانے کی تعظیم تھی۔

حضرت مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

اس سلسلے میں حضرت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا عجیب وغریب جملہ ارشاد فرمایا ہے، انہوں نے فرمایا کہ آکل اور ماکول مساوی سطح پر ہوں۔ کھانے والا اور جو چیز کھائی جائے دونوں ایک سطح پر ہونی چاہیے، یہ آدابِ اسلامی میں سے ہے، اگر آپ کو کسی وجہ سے ٹیبل پر کھانے کی ضرورت پڑ جائے تو کم از کم اپنے پیر اُٹھا کر کرسی پر رکھ لیں تاکہ کھانے سے قریب ہو جائیں، حضور اکرم ﷺ کھانا ٹیبل پر رکھ کر نہیں کھاتے تھے۔ لیکن اگر ہمیں اس کی ضرورت ہو تو کم از کم اس کا احساس ہونا چاہئے کہ یہ خلافِ سنت ہے، یہ نہ سمجھیں کہ یہ تو دقیانوسی طریقہ ہے۔ اس دقیانوسی طریقے میں جو راز اور انوار ہیں وہ لوگ نہیں جانتے۔

اسی طرح اگر ہاتھ سے لقمہ چھوٹ جائے یا گر جائے تو اس کو صاف کر کے کھانا چاہئے، دستر خوان اسی لیے بچھایا جاتا ہے کہ اگر اُس پر کوئی چیز گر جائے تو اُس کو کھا لیا جائے۔ اس میں نعمت کا اکرام اور تعظیم ہے۔ اور پھر بندگی کا اظہار بھی ہے۔ اس لئے سنت طریقہ پر کھانا چاہئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ:

ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ چنے کھا رہے تھے۔ اُن سے ایک چنا گر گیا۔ وہ تلاش کرنے لگے، پسینہ میں شرابور ہو گئے، جب دیر ہو گئی اور وہ ان کو نہ ملا تو ایک

بچے کو بلایا اور کہا کہ ایک چنے کا دانہ گر گیا ہے ذرا اُس کو تلاش کرو، میں تمہیں کچھ پیسے دے دوں گا، حالانکہ ان پیسوں میں بہت زیادہ چنے آسکتے تھے، پھر بعد میں اس کی وجہ بیان فرمائی کہ پہلے مجھے یہ خیال ہوا کہ میں تلاش کرنا چھوڑ دوں، پھر یہ احساس ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کل مجھ سے پوچھ لیا کہ تم نے ہماری نعمت کی ناقدری کیوں کی تو میں کیا جواب دوں گا؟ بس اس خیال نے مجھے پسینہ پسینہ کردیا اور میں نے سوچا کہ کسی بھی قیمت پر اس کو تلاش کرنا ہے۔ یہ ہے نعمت کی قدر اور تعظیم۔

یہ سب اسی لئے سنایا گیا ہے کہ جب آدمی کے پاس کوئی نعمت پہونچے تو اس کے پیچھے حق تعالیٰ کے اس نظام کو سونچے، تاکہ اس کی قدر دل میں پیدا ہو۔

سورج دینی نعمت بھی ہے:

بات در اصل سورج کے فوائد اور اس کے دنیوی اعتبار سے حق تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہونے سے متعلق چلی تھی۔ جیسے وہ دنیوی اعتبار سے نعمت ہے ایسے ہی دینی اعتبار سے بھی بہت بڑی نعمت ہے، دینی مسائل کا تعلق بھی اس کے ساتھ ہے، عبادتیں اس سے متعلق ہیں، دنوں اور مہینوں کی ابتداء اس سے متعلق ہے، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اس نظام کو حساب سے نہ رکھتے تو پھر شریعت پر چلنا مشکل ہوجاتا۔ کیونکہ شریعت کے بہت سے احکام اسی سے متعلق ہیں، کچھ کا تعلق سورج سے ہے اور کچھ کا تعلق چاند سے ہے۔ مثلا سورج کے نظام کا روزوں کے ساتھ تعلق ہے کہ صبح صادق سے پہلے سحری کا حکم ہے، اور سورج غروب ہوتے ہی افطار کا حکم ہے۔ اسی طرح نمازوں کے اوقات سورج سے متعلق ہیں، سورج طلوع ہونے سے پہلے فجر کی نماز پڑھنے کا حکم ہے، سورج غروب ہونے کے بعد مغرب کی نماز پڑھنے کا حکم ہے، زوالِ

شمس کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے کا حکم ہے، اور اگر سورج اتنا ڈھل جائے کہ کسی چیز کا سایہ دو مثل ہو جائے تو عصر پڑھنے کا حکم ہے، سورج کے غروب ہونے کے بعد سورج کی روشنی کے اثرات بھی ختم ہو جائیں تو عشاء کی نماز پڑھنے کا حکم ہے، جس کو غروب شفق کہتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد آسمان پر پہلے ایک سرخی آتی ہے، جس کو شفق احمر کہتے ہیں، اس کے بعد پھر ایک سفیدی آتی ہے، جس کو شفق ابیض کہتے ہیں، جب یہ دونوں شفق غائب ہو جاتے ہیں یعنی آسمان پر ظاہر ہونے والی سرخی اور سفیدی چلی جاتی ہے تو عشاء کی نماز پڑھنے کا حکم ہے۔

نمازِ عشاء امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے:

اُمت مسلمہ کے لیے یہ خاص نماز ہے۔ اس سے پہلے کسی بھی اُمت پر عشاء کی نماز فرض نہیں تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

"أَعْتِمُوا بِهٰذِهِ الصَّلَاةِ فَقَدْ فُضِّلْتُمْ بِهَا عَلٰى سَائِرِ الْأُمَمِ وَلَمْ يُصَلِّهَا أُمَّةٌ قَبْلَكُمْ"[۱]

"اس نماز کو تاخیر کے ساتھ ادا کرو، کیونکہ اس کے ذریعہ تم کو ساری امتوں پر فضیلت دی گئی ہے، اور تم سے پہلے کسی امت نے اس کو نہیں پڑھا ہے"۔

اسی وجہ سے اس نماز کو "صلوٰۃ العتمۃ" (اندھیرے کی نماز) کہا جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: "لَوْلَا أَنْ يَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِيْ لَأَخَّرْتُ صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَلَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ"[۲]

"اگر میری اُمت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس نماز کو تہائی رات تک مؤخر کرتا (اور بعض روایات میں ہے کہ مؤخر کرنے کا حکم دیتا) اور ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا"۔

۱: مسند احمد: حدیث معاذ بن جبل، ۲۲۱۷۱۔ ۲: مسند احمد: بقیۃ حدیث زید بن خالد: ۱۷۴۹۵۔

اس روایت میں آپ نے عشاء کی نماز کو تہائی رات تک مؤخر کرنے کی ترغیب دی ہے، لیکن امت پر مشقت کے خوف سے اس کا حکم نہیں فرمایا۔

وقتِ عشاء کے سلسلہ میں ایک غلط فہمی:

یہاں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ عشاء کی نماز کے بارے میں یہاں (امریکہ) کے لوگ کافی پریشان ہیں۔ صرف عشاء ہی نہیں بلکہ دیگر نمازوں کے اوقات میں بھی کافی گڑبڑ کی جارہی ہے، صرف تین مہینے کا مسئلہ ہے، آدمی کو صرف تین مہینے تھوڑا صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ عشاء کا وقت پونے گیارہ بجے شروع ہوتا ہے جاب(Job) سے رات کو چھٹی ہوتی ہے، پھر دوسرے دن جاب کو جانے میں مشقت ہوتی ہے، بس مولوی صاحب! کسی طریقے سے عشاء کا وقت جلدی کردیں، نئے نئے اجتہادات کی کوشش کی جاتی ہے، اور مختلف قسم کی باتیں کی جاتی ہیں اور مختلف نوعیت کے اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ یہ سائنس کا دور ہے، اس میں جو سائنسی تحقیقات ہیں پہلے زمانے والوں کو اس کا کیا اندازہ؟ اس لئے اس مسئلے سے متعلق چند باتیں ذہن میں رکھیں۔

نمازوں کے اوقات منصوص ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ نمازوں کے اوقات قرآن وحدیث میں وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، ان میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر جائز نہیں ہے، قرآن مجید میں اللہ پاک نے فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾[1]

”بے شک نماز مسلمانوں پر وقت مقررہ کے ساتھ فرض ہے۔“

[1]: النساء:۱۰۳۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ، اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾''[۱]

''پھر بڑی خرابی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لئے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں''

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صَلّٰى صَلَاةً بِغَيْرِ (لِغَيْرِ) مِيقَاتِهَا إِلَّا صَلَاتَيْنِ جَمَعَ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَصَلَّى الْفَجْرَ قَبْلَ مِيقَاتِهَا''[۲]

''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ نے کوئی نماز اس کے وقت کے علاوہ میں پڑھی ہو، مگر دو نمازیں یعنی مغرب اور عشاء (مزدلفہ میں) آپ نے جمع فرمائیں اور فجر کو اس کے وقت معتاد سے پہلے ادا کیا''[۳]

ان آیاتِ مبارکہ اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نمازوں کو ان کے اوقاتِ مقررہ پر ادا کیا جائے گا، اس میں تقدیم و تاخیر جائز نہیں ہے۔

وقتِ عشاء احادیث کی روشنی میں:

اور پھر شریعت میں عشاء کے وقت کی وضاحت بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس وقت عشاء پڑھتے تھے؟ اور کس وقت پڑھنے کا حکم فرماتے تھے؟ ایک حدیث میں ہے:

''وَيُصَلِّي الْعِشَاءَ حِيْنَ يَسْوَدُّ الْأُفُقُ''[۴]

''اور آپ عشاء کی نماز پڑھتے جس وقت افق سیاہ ہو جاتا''

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپ علیہ السلام سے پوچھا کہ میں عشاء کی نماز کب پڑھوں؟ تو آپ نے کہا کہ ''حِيْنَ اِسْوَدَّ الْاُفُقُ''[۵] جس وقت افق سیاہ ہو جائے تو اس وقت عشاء پڑھ لو، معلوم ہوا کہ سفید شفق کے غائب ہونے کے بعد جب سیاہی چھا جائے اس وقت عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے۔

۱: الماعون:۴و۵۔ ۲: صحیح بخاری: باب من یصلی الفجر بجمع:۱۶۸۲۔ ۳: تحفة الاحوذی: باب ماجاء فی الاسفار بالفجر، ومرقاۃ:۹/۱۵۷۔ ۴: سنن ابی داود: باب فی المواقیت، ۳۹۴۔ ۵: نصب الرایہ:۱/۲۳۴۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے کہ ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازوں کے اوقات کے بارے میں پوچھا، آپ نے حضرت بلال سے اذان کے لئے کہا، وہ مختلف نمازوں کے لئے اذان دیتے رہے، اور عشاء کے لئے اس وقت اذان دی جس وقت دن کی سیاہی ختم ہوگئی، بعض روایتوں میں اتنا اضافہ ہے کہ آپ نے ان کو ٹھہرنے کا حکم دیا، اور بعد میں فرمایا کہ یہ اوقات نماز ہیں، اس اعتبار سے تم نماز ادا کیا کرو۔ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے مسلک پر یہ سب سے واضح اور صریح دلیل ہے، اس سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ عشاء کا وقت شفق ابیض کے غروب کے بعد ہوتا ہے۔[1]

وقتِ عشاء کے بارے میں حضرت ابو بکر، عمر، عائشہ اور معاذ رضی اللہ عنہم کا مسلک:

یہی حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عائشہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کا مسلک تھا۔[2]

وقتِ عشاء کے بارے میں مفتیٰ بہ قول اور علماء دیوبند کے فتاویٰ:

یہی امامِ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ صاحبِ بحر اور علامہ ابنِ ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے امام صاحب ہی کے قول کو احوط لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل علماء دیوبند کے فتاویٰ میں بھی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو مفتیٰ بہ اور محتاط قرار دیا گیا ہے۔ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امام صاحب کا قول ہی راجح ہے۔ صاحبین کا قول روایت اور درایت دونوں اعتبار سے ضعیف ہے۔[3]

---

[1]: اعلاء السنن: باب المواقیت، ۱۷/۲۔ [2]: بدائع الصنائع: ۵۶۹/۱۔ [3]: اعلاء السنن: باب المواقیت: ۱۳/۱۔ البحر الرائق: کتاب الصلاۃ: ۴۲۷/۱ وفتح القدیر کتاب الصلاۃ: ۲۲۲/۱۔ فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۴۹/۲۔ فتاویٰ رحیمیہ: ۷۹/۴۔ فتاویٰ محمودیہ: ۳۴۷/۵۔ تعلیم الاسلام: ۳۔ وفتاویٰ عثمانی: ۳۶۰/۱۔ خیر الفتاویٰ: ۱۹۰/۲۔ فتاویٰ فریدیہ: ۱۴۶/۲۔

وقتِ فجر اور مغرب کے بارے میں ایک اصول:

اس کے علاوہ ایک اصول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔وہ یہ ہے کہ فجر اور مغرب کا وقت برابر ہوتا ہے۔یعنی صبح صادق سے سورج کے طلوع ہونے تک،اسی طرح غروبِ شمس سے شفق کے غروب ہونے تک کے اوقات برابر ہوتے ہیں،اگر صبح کا وقت دو گھنٹے ہوں تو مغرب کا وقت بھی دو گھنٹے ہوتا ہے۔ آپ ہماری مسجد نور(شکاگو) کے ٹائم ٹیبل کو دیکھ لیں، دونوں برابر ہوں گے۔

اس لئے اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک ہی پر فتویٰ ہے،اسی پر عمل کیا جائے گا اور اسی میں احتیاط بھی ہے۔ورنہ آدمی کی عبادتوں کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اپنی ذاتی رائے کو بنیاد بنا کر امت میں تفرقہ نہ پیدا کیا جائے،جیسے دوسرے مسائل علماء سے پوچھے جاتے ہیں اسی طرح اوقاتِ نماز کے مسائل بھی انہی سے پوچھنے چاہیے۔اگر کسی نئی چیز کا انکشاف ہو تو اُنہیں سوال کی صورت میں علماء اور اہل مدارس کے پاس بھیجنا چاہیئے۔تاکہ اس کا حل نکالا جاسکے۔

اوقات سے متعلق نئی اور پرانی تحقیق کا تقابل:

دوسری بات یہ ہے کہ آج کے زمانے میں کچھ لوگ سائنسی تحقیقات سے مرعوب ہو کر اور اس کو حرف آخر سمجھ کر بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔اگر ہم اس مسئلہ کو اس نظریہ سے دیکھیں تو آج کی سائنسی ترقی تو ہمیں تسلیم ہے،لیکن دوسری طرف یہ بات بھی طے ہے کہ اوقات کے معاملے میں ساڑھے چار ہزار سال پرانی اور آج کی تحقیقات میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت سے

وہ فن پہلے ہی اتنا مکمل ہو گیا کہ آج کے ترقی یافتہ لوگ بھی اس میں کچھ اضافہ نہ کر سکے۔ بعض چیزوں میں اضافہ لگتا ہے لیکن حقیقتاً وہ اضافہ نہیں ہے۔ ہماری تحقیقات یہ ہیں کہ چوبیس گھنٹے کا دن ہوتا ہے، ایک سال میں (۳۶۵) دن ہوتے ہیں، اور سورج عرض البلد کے حساب سے پینتالیس ڈگری پر ہوتا ہے تو اُس کا وقت کیا ہوتا ہے؟ جب پندرہ ڈگری پر ہوتا ہے تو اس کا وقت کیا ہوتا ہے؟ آج تک ان تحقیقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگرچہ بعض بنیادی تحقیقات میں فرق ہے لیکن ان تحقیقات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً پہلے زمین کے گھومنے کا تصور نہیں تھا بلکہ یہ تصور تھا کہ سورج گھومتا ہے۔ اس نظام کو سورج کی گردش کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ سورج کی گردش اپنی جگہ پر ہے اور یہ نظام زمین کی گردش سے ہے۔ لیکن اس تحقیق کی تبدیلی کے باوجود پہلے دن کے پچیس گھنٹے ہوتے تھے اب چوبیس گھنٹے ہو گئے، یا پہلے تیئس تھے تو اب چوبیس گھنٹے ہو گئے ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، سال کا نظام، دن کا نظام، سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا نظام، دنوں کے گھٹنے اور بڑھنے کا نظام، اسی طرح اس کے خط استواء پر ہونے کے نظام میں آج تک ایک سیکنڈ (second) کا بھی فرق نہیں آیا۔ ساڑھے چار ہزار سال پہلے سال کے جس بڑے اور چھوٹے دن کی تعین کی گئی تھی آج بھی وہی ہے۔ اور سال کی جس بڑی اور چھوٹی رات کی تعین کی گئی تھی آج بھی وہی ہے۔

اس وقت کے ماہر فلکیات و نجومیات نے جو کچھ لکھا تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔ آج کے لوگ اُسی کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں اور وہ بالکل صحیح ہے۔

ایک غلط فہمی:

نیز اس نظام کا تعلق جگہ سے نہیں ہے کہ اہلِ ہند کو امریکہ کے اوقات کا کیا اندازہ ہوگا؟ جیسے ناواقف لوگ جہالت کی باتیں کرتے ہیں انہیں میں سے ایک بات یہ بھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ دوسرے ملک والوں کو یہاں کے نظام کا یہاں کے اوقات کا کیا پتا؟ ایسی بات نہیں ہے، علم ہیئت کی وجہ سے ایک ملک والے دوسرے ملک والوں کا ٹائم ٹیبل بتاسکتے ہیں، کیونکہ سورج، چاند اور زمین کا ایک محکم نظام ہے اور اس کی ایک ترتیب ہے، زمین کے گردش کرنے کے نظام سے پتہ چل جاتا ہے کہ زمین کتنی دیر میں کتنی گردش کرتی ہے؟ پندرہ منٹ میں زمین کتنی مسافت طے کرتی ہے؟ اور اس وقت سورج کہاں طلوع ہورہا ہوتا ہے؟ اس طرح پوری دنیا میں آرام سے دن اور رات کا، اسی طرح وقت کا پتہ چل جاتا ہے۔

اس مسئلہ میں ہمیں دوسروں پر تنقید مقصود نہیں، بس حق بات کا آپ تک پہونچانا اور غلطی سے آپ کو محفوظ رکھنا ہے، اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اسی لئے علمائے کرام نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، اور انہیں کے فتاویٰ کے مطابق اوقاتِ صلوٰۃ کا ٹائم ٹیبل (Timetable) چھپایا جاتا ہے، ایک بڑے عالم مولانا محمد موسیٰ روحانی صاحب (جو علم فلکیات کے ماہر جانے جاتے ہیں) کی بہت سی کتابیں ہندوستان اور پاکستان میں موجود ہیں۔ محترم عبداللطیف صاحب کی ایک کتاب ”اوقاتِ صلوٰۃ“ کے نام سے چھپی ہوئی ہے۔ جس میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اور دیگر بڑے بڑے علمائے کرام کی تقاریظ بھی موجود ہیں۔ اس میں پوری دنیا

کے اعتبار سے اوقات کی تخریج کی گئی ہے۔اس طرح کی کتابیں لے کر مطالعہ کیا جاسکتا ہے،اور اس سے نمازوں کے اوقات متعین کئے جاسکتے ہیں۔

نمازِ ظہر کے سلسلہ میں ایک گمراہی:

اسی طرح ایک مسئلہ ظہر کا بھی ہے،سفر کا بہانہ ہو،یا کوئی معمولی ضرورت پیش آجائے تو ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھ لی جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔احادیث میں اس کو کبیرہ گناہ بتایا گیا ہے۔

جمع بین الصلاتین پر وعید:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

"مَنْ جَمَعَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ فَقَدْ أَتَى بَابًا مِنْ أَبْوَابِ الْكَبَائِرِ"[1]

"جو آدمی بغیر عذر کے دو نمازوں کو (ایک ہی وقت میں) جمع کرے (پڑھے) گا تو وہ کبیرہ گناہوں کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر آئے گا۔

جمع بین الصلاتین کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان:

"عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ كَتَبَ فِي الْآفَاقِ يَنْهَاهُمْ اَنْ يَّجْمَعُوْا بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ وَيُخْبِرَهُمْ اَنَّ الْجَمْعَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ فِيْ وَقْتٍ وَاحِدٍ كَبِيْرَةٌ مِّنَ الْكَبَائِرِ .اَخْبَرَنَا بِذٰلِكَ الثِّقَاتُ"[2]

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے آفاق میں خط لکھا تھا کہ وہ لوگوں جمع بین الصلاتین سے روکیں،اور ان کو خبر دے دیں کہ جمع بین الصلاتین ایک وقت میں کبیرہ گناہ ہے۔اس روایت کو ثقہ راویوں نے ہم سے بیان کیا ہے۔

---

[1] سنن الترمذی:باب ماجاء فی الجمع بین الصلاتین فی الحضر،١٨٨۔

[2] مؤطا محمد:باب الجمع بین الصلاتین فی السفر،٢٠٥۔

جمع بین الصلاتین والی روایات کے جوابات:

(۱)رہی وہ احادیث جن میں سفر میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا ذکر ہے تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وہ قرآن سے متعارض ہے، اور ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث میں ٹکراؤ ہو تو قرآن کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لئے ظہر اور عصر کی نماز کا جو وقت احادیث سے ثابت ہوتا ہے، اسی پر عمل کیا جائے گا، دو نمازوں کو جمع کرنے والی روایت کو ترک کر دیا جائے گا۔

(۲)دوسرا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں صورتاً جمع کرنا مراد ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ظہر کی نماز اتنی دیر سے پڑھی جائے کہ وقت ختم ہونے لگے، جیسے ہی ظہر کی نماز سے فراغت ہو، کچھ دیر انتظار کیا جائے، پھر جیسے ہی عصر کا وقت شروع ہو جائے تو عصر بھی پڑھ لی جائے، اسی طرح مغرب اور عشاء میں کیا جائے، اس صورت میں ظہر اپنے وقت میں پڑھی گئی اور عصر اپنے وقت میں پڑھی گئی۔ لیکن بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک ساتھ پڑھی گئیں۔ حدیث مبارکہ میں دو نمازوں کو جمع کرنے کی جو اجازت ہے اس کا مطلب یہ ہے، حقیقتاً دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا مراد نہیں ہے۔ اوراس طرح جمع کرنے کی سفر میں آپ ﷺ نے اجازت دی ہے۔

اگر ہم ان روایات کو جمع صوری پر محمول کرتے ہیں تو تمام آیات اور روایات میں تعارض ختم ہو جاتا ہے، اور اگر حقیقت پر محمول کرتے ہیں تو پھر آیاتِ مبارکہ اور احادیث مبارکہ کو ترک کرنا لازم آتا ہے، اس لئے اس کو جمع صوری پر محمول کیا جائے گا۔

اوقاتِ نماز کی عدمِ رعایت قرآن مجید سے بغاوت ہے:

یہاں امریکہ میں سفر کا بھی مسئلہ نہیں ہے، جاب (job) میں تاخیر کا مسئلہ ہے یا آفس میں وقت نہیں ملتا ہے تو دو نمازوں کو جمع کر لیا جاتا ہے، آپ ڈیٹورائٹ

میں دیکھ لیں، ہم نے دسیوں مرتبہ ڈیٹورائٹ (Detroit) کی مساجد میں دیکھا ہے کہ جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے، اُس کے بعد ہی عصر کی اقامت ہوتی ہے، تمام نمازی جمعہ کے ساتھ عصر کی نماز بھی پڑھکر چلے جاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذالک) یہ فتنہ ہے۔ یہ قرآن پاک کی کھلی تردید اور مخالفت ہے۔ قرآن پاک کہہ رہا ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾

”نماز ایمان والوں پر وقت مقررہ کے ساتھ فرض ہے“

اور ہم اس کی مخالفت اور اس سے بغاوت کر رہے ہیں۔ صبح جاب پر جانا ہے اس لئے فجر پہلے ہی سے پڑھکر سو جائیں یا جاب سے واپسی پر تین چار نمازیں ملاکر پڑھ لیں یا آفس میں وقت نہیں مل رہا ہے اس لئے دو نمازوں کو ایک ساتھ جمع کر لیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔

چاند کی نعمت:

جیسے سورج دینی اور دنیوی اعتبار سے اللہ پاک کی بہت بڑی نعمت ہے اسی طرح چاند بھی اللہ پاک کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔

کیا احکامِ شرع کا مدار حساب پر ہے:

شریعت کے کئی مسائل چاند سے بھی متعلق ہیں، رمضان کا چاند دیکھ روزہ رکھنے کا حکم ہے، عید الفطر بھی چاند پر موقوف ہوتی ہے، یہ صحیح ہے کہ چاند کی پیدائش اور عدم پیدائش کا حساب سے پتہ چل جاتا ہے لیکن مسائل کا تعلق حساب پر نہیں رکھا گیا، بلکہ چاند دیکھنے پر رکھا گیا ہے۔

کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ، وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ غُبِّيَ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ“[1]

چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور چاند دیکھ کر افطار کرو، لیکن اگر بدلی چھا جائے تو تیس دن مکمل کرو۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم امی قوم ہیں، حساب وکتاب نہیں جانتے، مہینہ کبھی انتیس کا ہوتا ہے اور کبھی تیس کا۔[2]

لہذا اگر انتیس کو چاند نظر آجائے جیسا کہ دوسری روایت میں ہے تو روزہ رکھنا ہے، اور اگر نظر نہ آئے تو تیس دن مکمل کرنا ہے۔ اس حدیث میں آپ نے وضاحت فرمائی کہ مہینے کا مدار حساب وکتاب پر نہیں ہے۔ بلکہ چاند دیکھنے پر ہے۔

بعض مرتبہ حساب وکتاب کے بعد عید کا اعلان کردیا جاتا ہے اور رمضان کا آخری دن شوال میں شامل کیا جاتا ہے، یہ انتہائی بے وقوفی اور دین وشریعت سے دوری کا نتیجہ ہے۔

پورے رمضان میں جتنے لوگوں کی مغفرت ہوتی ہے، رمضان کے آخری دن اُتنے ہی لوگوں کی مغفرت کی جاتی ہے، اور رمضان کے ہر دن میں دس لاکھ سے زائد آدمیوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ لیکن اگر حساب کی روشنی میں اس دن عید ہوئی اور حقیقۃً وہ رمضان ہی کا دن تھا تو اس مبارک دن میں ہم نے اس فریضہ کو چھوڑ دیا، مغفرت کے بجائے الٹا گناہ کے ہم مرتکب ہوئے۔

اسی طرح حج جیسی عظیم عبادت کا مدار بھی چاند پر موقوف ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

”يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ“[3]

لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ انہیں بتادیجئے کہ یہ (چاند) لوگوں کے (مختلف معاملات کے) اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لئے ہیں۔

۱: صحیح بخاری: باب قول النبی ﷺ اذا رأیتم الھلال، ۱۹۰۹۔ ۲: صحیح بخاری: باب قول النبی ﷺ لانکتب ولانحسب، ۱۹۱۳۔ ۳: البقرۃ: ۱۸۹۔

اب آپ سوچئے کہ دنیا کے اعتبار سے چاند وسورج نعمت تو ہیں ہی، لیکن دین کے اعتبار سے بھی ان کی کتنی اہمیت ہے؟

نظامِ کائنات کا مقصد:

حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کے نظام کو جگہ جگہ ذکر کر کے ارشاد فرمایا کہ تم اس کو دیکھو اور غور کرو۔ جو لوگ اس میں غور و فکر کرتے ہیں وہ عقل والے ہیں:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾[1]

”بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں“۔

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾[2]

”بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں رات دن کے لگاتار آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندروں میں تیرتی ہیں، اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی، اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، اور ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں“۔

۱: آل عمران: ۱۹۰۔ ۲: البقرہ: ۱۶۴۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی اس آیتِ کریمہ کی تلاوت کرے اور اللہ کی مخلوق میں غور و فکر نہ کرے اُس کے لیے تباہی ہے۔ ہمارے سامنے جو کائنات پھیلی ہوئی ہے اُس پر ہم کبھی نظرِ عبرت ڈالتے ہی نہیں۔ قرآن پاک میں ان چیزوں پر فکر اور تدبر کی دعوت دی گئی کہ ان چیزوں کو دیکھو اور یہ سوچو کہ یہ نظام کس نے بنایا ہے؟ اور کیوں بنایا ہے؟ میرے دوستو! اللہ پاک نے یہ نظام ہمارے لیے بنایا ہے۔ اس کو ہمارے لئے مسخر کیا ہے۔

اَبر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند　　تا تونانے بہ کف آری و بہ غفلت نہ خوری

ابر، ہوا، چاند، سورج اور فلک تمہاری خدمت میں لگے ہوئے ہیں تاکہ روٹی تمہارے ہاتھ تک پہنچے اور غفلت سے نہ کھاؤ۔

نجم و شجر کے سجدہ سے کیا مراد ہے؟:

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ﴿٦﴾

”اور بیلیں اور درخت سب اس کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔“

نجم ان کو کہتے ہیں جن کے تنے نہیں ہوتے یعنی بیلیں، اور شجر اُن درختوں کو کہتے ہیں جن کے تنے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری نعمتوں میں سے بیلیں اور درخت ہیں جو ہمارے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کے سجدہ کرنے سے مراد ان کے سایہ کا سر افگندہ ہونا ہے۔[۱]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ نجم سے مراد ستارے ہیں اور ان کے سجدے سے مراد ان کا غروب ہونا ہے، اور درختوں کا سجدہ ان کے سایہ سے ہوتا ہے یعنی ان کے سایہ کا گھومنا۔[۲]

۱: تفسیرِ مظہری: ۱/ ۶۲۸۳۔ ۲: روح المعانی: ۲۰/ ۱۱۵۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ سجدے کی حقیقت پیشانی کو زمین پر رکھنا ہے۔ اور یہ درخت اپنی پیشانی اور اپنا سر زمین ہی پر رکھے ہوئے ہیں، اس لئے کہ سر وہ ہوتا ہے جہاں سے حیوان غذا حاصل کرتا ہے، اور اس کے ذریعہ اس کا وجود رہتا ہے، اور درخت کی جڑوں میں یہی صفات ہوتی ہیں، اس لئے درخت کی جڑیں ہی اصل ہیں، اور وہ زمین میں ہوتی ہیں، وہیں سے وہ پانی لیتی ہیں، وہیں سے غذا حاصل کرتی ہیں، اس لئے یہ سب سجدے ہی کی حالت میں ہیں۔[1]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ان کے سجدہ کرنے سے مراد ان کا تابع اور مطیع ہونا ہے،[2] یعنی اللہ پاک نے انہیں جس خاصیت اور مقصد کے لئے پیدا کیا ہے وہ اسی میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا اور اُن میں اپنا حکم نافذ کر دیا۔ وہ سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر درخت کام نہ کرے یعنی پھل نہ دے، سایہ نہ دے، اُس میں لکڑی نہ آئے تو پھر مخلوق کیسے زندہ رہے گی؟ جن کا کام غلّہ نکالنا ہے وہ غلّے نکال رہے ہیں، جن کو پھل نکالنا ہے وہ پھل نکال رہے ہیں، جن کو پھول نکالنا ہے وہ پھول نکال رہے ہیں۔ خوشبو والے الگ ہیں، اور بغیر خوشبو کے الگ ہیں، اور خوشبوؤں میں پچاسوں خوشبوؤں کے پھول ہیں، ان کی رنگت بھی الگ الگ ہے، اوران کا حسن و جمال بھی الگ الگ ہے۔

پھر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ نظام ہے کہ جو پھل وزنی ہوتے ہیں وہ درخت میں نہیں لگتے۔ بلکہ زمین پر سوئے ہوتے ہیں، اگر وہ درخت سے ٹوٹ کر کسی کے سر جا لگیں تو اس کا سر پھٹ جائے، اور پھر درختوں کا اسے سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے۔ جیسے تربوز، خربوزہ، انگور کے خوشے وغیرہ۔

---

[1]: تفسیر رازی: ۱۵/۵۶، ط: دار الفکر۔ [2]: روح المعانی: ۲۰/۱۱۵۔

پتوں کے فوائد:

اور پھر ان درخت کے پتوں کا بھی ایک نظام ہوتا ہے، چھوٹے پتوں کا نظام الگ ہوتا ہے، بڑے پتوں کا نظام الگ ہوتا ہے، بڑے درختوں کے پتے عام طور پر بڑے نہیں ہوتے، کیونکہ اگر بڑے درختوں کے پتے بھی بڑے ہوں تو پانی اُن کی جڑوں تک نہیں پہنچ پائے گا، اس واسطے بڑے درختوں کے پتے چھوٹے ہیں تاکہ پانی اُن کی جڑوں میں بہ آسانی پہنچ جائے۔ اور ان سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

ان کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان سے ساری فضا کی آلودگی دور ہوتی ہے، تمام میل کچیل یہ ہضم کر جاتے ہیں۔ گویا سارا میل کچیل ان کی غذا ہے، اور انہیں اس کا مکلف بنایا گیا ہے۔

دن بھر گاڑیاں چلتی ہیں، لوگ چلتے ہیں، دھوپ کی بھی تمازت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے شام تک یہ فضا تو بدبودار اور آلودہ ہو جانا چاہئے، لیکن عصر کے بعد پوری فضا صاف ہو جاتی ہے۔ دن کے تمام میل کچیل سامنے آنے کے بجائے غائب ہو جاتے ہیں۔ ایک ایک پتے میں اتنی خوبیاں اور اتنے کمالات ہیں کہ ان کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

درختوں کے پتے معرفتِ الٰہی کا ذریعہ ہیں:

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ پتے بھی اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں، ان میں بھی اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، اسی وجہ سے مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

برگِ درختانِ سبز دَر نظرِ ہشیار
ہر ورقِ دفتریست دَر معرفتِ کردگار

سبز درختوں کا ایک ایک پتہ سمجھدار آدمی کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دفتر ہے، اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے ایک پتہ گویا ایک کتاب ہے۔

ابتدائی نعم کے درمیان حرف ”واو“ کے عدمِ ذکر کی حکمت:

اللہ پاک نے اولاً جن چار صفات اور چار نعمتوں کو ذکر فرمایا ہے ان میں کسی میں بھی واو نہیں ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْآنَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾

بعد کی جو چار نعمتیں ہیں اس میں واو موجود ہے: ﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ، وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ، وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ﴾

اس کی وجہ مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ زبان کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے، وہ یہ کہ جو چیز بغیر ”واو“ کے ذکر کی جاتی ہے اُس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے، اور جو چیز واو کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے اس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جب خاص اور بڑی بڑی نعمتوں کو گنوایا جاتا ہے اور کسی کو لاجواب کرنا مقصود ہوتا ہے تو بیچ میں ”واو“ استعمال نہیں کیا جاتا۔[۱] مثلاً کہتے ہیں کہ ”تمہیں کھلایا، پلایا، بڑا کیا، اب تم سینہ تان رہے ہو“ ان تمام نعمتوں کے بیچ میں ”واو“ استعمال نہیں کیا گیا، کیونکہ مد مقابل کو خاص خاص نعمتوں کے ذریعہ لاجواب اور ساکت کرنا مقصود ہے۔ اس کے بعد جب ضمنی احسانات کا ذکر کرنا ہوتا ہے اور نعمتوں کی کثرت کو بتلانا ہوتا ہے تو ”واو“ استعمال کرتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ ”اور پھر یہ ہے کہ جب آپ کو پیسوں کی ضرورت پڑی تو ہم نے پیسے دئے، اور فلاں چیز کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہم نے وہ چیز دی۔ اور پھر آپ کے کھانے پر کوئی پابندی نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہاں ”اور“ بعد میں استعمال کیا جاتا ہے، اس سے ضمنی احسانات اور ان کی کثرت مراد

۱: تفسیر رازی: ۱۵/ ۵۵۔

ہوتی ہے۔ مفسرین نے فرمایا کہ ابتدائی تین نعمتوں کے بیان پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''واو'' کو استعمال نہیں فرمایا۔ کیونکہ وہ نعمتیں بڑی ہیں، ان کے ذریعہ مخاطب کو لاجواب اور ساکت کرنا مقصود ہے، پھر اس کے بعد دوسری نعمتوں کو بیان فرمایا کہ اور بھی نعمتیں ہم نے تمہیں دی ہیں، وہ یہ ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ رحمٰن نے انسان کو قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا، اُس کو بیان سکھلایا۔ ان نعمتوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے احسانات میں دَب جائے اور لاجواب ہوکر اس کی باتوں کو مان لے اور اس کی شکر گزاری کرے۔ پھر فرمایا کہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ سورج بھی تمہارے لئے بنایا ہے، اور چاند بھی تمہارے لئے ہے۔ اور بیلیں بھی تمہارے لئے ہیں، اور آسمان کے بلند کرنے کا نظام بھی تمہارے لئے ہے، اور زمین کے بچھانے کا نظام بھی تمہارے لئے ہے۔ اور شجر بھی تمہارے لئے ہے۔ اور پھل بھی تمہارے لئے ہے، اور غلہ بھی تمہارے لئے ہے۔ تاکہ بندہ کو حق تعالیٰ کے سامنے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں کسی قسم کی جھجھک نہ ہو۔

پہلی تین صفات کی نسبت حق تعالیٰ نے اپنی جانب کیوں کی؟

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ پہلی تین صفات میں اللہ تعالیٰ نے فعل کی نسبت اپنی جانب کی ہے، چنانچہ فرمایا کہ رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا، بیان سکھلایا، لیکن اس کے بعد حق تعالیٰ جن صفات کا ذکر کررہے ہیں ہے اُن میں کسی نعمت کو اپنی جانب منسوب نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا کہ سورج اور چاند حساب میں ہیں، یہاں یہ نہیں فرمایا کہ سورج وچاند کو میں نے چلایا، حالانکہ ان کو اللہ تعالیٰ ہی نے چلایا ہے، ایسے ہی یہ نہیں فرمایا کہ ''نجم و شجر کو میں نے سجدے میں رکھا''، بلکہ فرمایا کہ نجم و شجر تو سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ اسلوب اللہ پاک نے اس لئے اختیار فرمایا

ہے کہ جن نعمتوں میں نسبت اپنی جانب کی ہے ان کی اہمیت اور عظمت اور ان کی طرف زیادہ توجہ دلانا مقصود ہے، کیونکہ جس چیز کی جانب حق تعالیٰ اپنی نسبت کرتے ہیں وہ بہت ہی اہمیت اور عظمت والی ہوتی ہے۔[۱]

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری نعمتیں معمولی ہیں، وہ بھی اپنی جگہ بہت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، لیکن دوسری بڑی بڑی نعمتوں کے مقابلے میں ان کی اہمیت کم ہوتی ہے۔ اس لئے ان چھوٹی نعمتوں میں نسبت اپنی جانب نہیں کی۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے کلام میں کتنی باریکیاں ہیں، کتنے اسرار ورموز چھپے ہوئے ہیں، یہ تو وہ علوم ہیں جو کتابوں میں آگئے جبکہ کتنے بزرگ اوراولیاءاللہ ایسے ہیں جنہوں نے کتابیں نہیں لکھیں، اُن کے علوم تواُن کے ساتھ چلے گئے، لیکن یہ ایسا کلام ہے کہ اس کی باریکیاں، اس کے عجائبات اوراس کے اسرار ورموز کبھی ختم نہیں ہوسکتے۔

بیلوں کو درختوں پر مقدم کرنے کی وجہ:

اللہ تعالیٰ نے بیلوں کو پہلے ذکر فرمایا اور درختوں کو بعد میں ذکر فرمایا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیلیں باطنی اور ظاہری اعتبار سے سجدے میں ہیں، اور درخت ظاہری اعتبار سے کھڑے ہوئے ہیں، حالانکہ اس کی جڑ بھی سجدے میں ہے، اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ نے نجم کو پہلے ذکر فرمایا اور شجر کو بعد میں ذکر فرمایا۔[۲]

ارض وسماء کی صرف دودو نعمتوں ہی کا ذکر کیوں؟:

مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارض وسماء کی صرف دودو نعمتیں ہی ذکر کی ہیں، کیونکہ شمس وقمر سب پر ظاہر ہیں، ان کے فوائد لوگوں میں مشہور ہیں، جب کہ

۱: تفسیر رازی: ۱۵/ ۵۴۔ ۲: تفسیرِ رازی: ۱۵/ ۵۶۔

ستارے اور دیگر نعمتوں کا نظام نظروں سے غائب ہے، اور لوگ اُس کو سمجھ بھی نہیں پاتے، اس لئے صرف انہیں دو کا ذکر فرمایا، اور زمین میں نجم اور شجر کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ آدمی کی غذا کا تعلق اسی سے ہے۔ کیونکہ آدمی کی غذا یا تو نباتاتی ہے یا حیواناتی، جیسے گوشت، دودھ، جانور کے اعضاء وغیرہ۔ اور پھر حیوانات کی بقا نباتات ہی پر ہے، اور اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو انسانوں کی غذا ہے، جیسے گیہوں، جو، درختوں کے پھل وغیرہ۔ اور ایک وہ جو جانوروں کی غذا ہے، جیسے گھاس، بھوسا، لکڑی وغیرہ۔ اس لیے یہاں پر حیوانات کا ذکر نہیں، بلکہ نباتات کی صرف دو ہی قسموں کا بیان ہے۔[۱]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ پاک نے ان نعمتوں کو کیوں ذکر کیا؟ وہ اس وجہ سے تا کہ ہم ان نعمتوں کے بارے میں سوچیں، غور و فکر کریں، اور اس سے دل میں اللہ پاک کی محبت پیدا کریں، اس کی عظمت کو جانیں۔ اور اس کی اطاعت کریں۔

اللہ اور رسول سے محبت کی پہچان اور اس کی حقیقت:

بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر آدمی روزانہ پانچ، دس منٹ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں کا مراقبہ کرے تو اس کی محبت دل میں پیدا ہوگی، اور جب محبت دل میں پیدا ہوگی تو اس کی بندگی آسان ہو جائے گی۔ سارا دارومدار اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر ہے۔ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ دل جس چیز میں مشغول ہو اُس سے لطف اندوز ہو، اور اُس سے لذت حاصل کرے ۔ اگر آدمی پیسوں میں مزہ اور دلچسپی لیتا ہے تو پیسوں سے محبت ہے۔ اگر عورت میں مزہ لیتا ہے تو عورت سے محبت ہے۔ اگر کپڑوں میں مزہ لیتا ہے تو کپڑے سے محبت ہے۔ اگر کاروں میں مزہ لیتا ہے تو کاروں سے محبت ہے۔ اگر قصے کہانیوں میں مزہ لیتا ہے تو قصے کہانیوں سے محبت ہے۔ اگر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ

۱: تفسیر رازی: ۱۵/۵۳۔

کی باتوں میں مشغول ہو کر اس سے مزہ لیتا ہے تو اللہ اور رسول سے محبت ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کی پہچان ہی یہی ہے کہ اس کے ذکر میں اس کی بڑائی میں اس کی عبادت میں مزہ آئے۔

ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ“[1]

”میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں کر دی گئی ہے“۔

حضور اکرم ﷺ کی تھکان دُور کرنے کا ذریعہ:

جب آپ ﷺ بالکل تھک جاتے تھے تو سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ نماز شروع فرماتے اور اس میں مشغول ہو جاتے۔ صبح سے شام تک گشت کرتے، لوگوں سے ملاقاتیں کرتے، اور دعوت دے کر جب گھر واپس ہوتے تو تھکن سے پیر اپنی جگہ صحیح نہ پڑتے، ایک جگہ رکھتے تو دوسری جگہ پڑتا، اور کوئی آپ کا اکرام بھی نہیں ہوتا تھا، ہر قسم کی بدتمیزی آپ کے ساتھ کی جاتی، پورا جسم مبارک گرد و غبار میں اَٹ جاتا۔ چہرہ، داڑھی اور کپڑے گرد و غبار سے بھر جاتے۔ ان سب کے باوجود آپ گھر پہنچتے ہی نماز شروع فرماتے۔ آپ (ﷺ) کو نماز میں ایسا لطف آتا تھا کہ ساری تکان اس سے دُور ہو جاتی۔ اسی وجہ سے روایتوں میں آتا ہے کہ آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرماتے: ”يَا بِلَالُ أَرِحْنَا بِالصَّلَاةِ“[2] ”اے بلال! نماز کے ذریعہ ہمیں راحت پہنچاؤ۔“

اگر اللہ تعالیٰ کی محبت ہمارے دلوں میں ہو تو پھر عبادتوں میں مزہ آنے لگتا ہے، اگر نماز میں سستی ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں خلل ہو رہا ہے، لہٰذا اب اُس کی تربیت ضروری ہوتی ہے۔ ایسے ہی قرآن پاک کی تلاوت میں،

---

[1]: سنن نسائی: کتاب عشرة النساء: باب حب النساء، ۳۹۵۷۔ [2]: مسند احمد: ۲۳۷۸۹۔

ذکر میں، اللہ تعالیٰ کی بندگی میں سستی ہورہی ہے تو یہ محبت کی کمی کی علامت ہوتی ہے۔ کتاب میں جو ''محبت'' کی حقیقت لکھی ہے وہ میں آپ لوگوں کو سنا رہا ہوں۔ جب کسی چیز میں دل مشغول ہوکر اُس سے مزہ لینے لگتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے تو یہ اُس چیز کی محبت کی علامت ہے۔

ایسے ہی نبی کی سنتوں کو ہم اپنا رہے ہیں اور ہمیں اس میں مزہ آرہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں رسول سے محبت ہے، جب سارے لوگ سنت کو ٹھکرا رہے ہوں اور ہم سنت پر عمل کرکے خوش ہوں تو پھر یہ محبت اور کمال کی علامت ہے، شادی بیاہ کا موقع ہے، ہم سنت پر عمل پیرا ہیں، کپڑے ہمارے سنت کے مطابق ہیں، کھانے پینے کا طور طریقہ سب سنت کے موافق ہے، سارے لوگ کرسیوں پر بیٹھ کر کھا رہے ہیں اور یہ نیچے بیٹھ کر کھا رہا ہے،، سب لوگ اس پر ہنس رہے ہیں، اس کا مزاق اڑا رہے ہیں اور اسے مزہ آرہا ہے کہ یہ ہمارے محبوب ﷺ کی ادا ہے، تو پھر یہ حقیقی محبت ہے۔

روح کی بلوغت:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب بلوغ کی لذت شروع ہوتی ہے تو اُس سے پہلے کھیل کود کی لذتوں کا کوئی مقام آدمی کے پاس نہیں ہوتا۔ جب تک بچہ بالغ نہیں ہوتا اس وقت تک اس کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ بھی کوئی لذت کی چیز ہے۔

ایسے ہی ایک بلوغ روح کا بلوغ ہوتا ہے اور روح کی پختگی ہوتی ہے۔ جس میں روح اللہ تعالیٰ کے ذکر اور عبادت کرکے مزے لیتی ہے۔ جب عبادتوں میں مزہ آنے لگتا ہے تو پھر یہ روح کے بلوغ کی علامت ہوتی ہے، جب یہ لذت حاصل ہونی شروع ہوتی ہے تو پھر دنیا کی بڑی سے بڑی لذت اس کے سامنے ہیچ ہوتی ہے۔

محبت کے حصول کا طریقہ:

لیکن اس لذت کو اور اللہ کی محبت کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اللہ پاک نے وہ طریقہ اس سورت میں بار بار ذکر فرمایا ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر۔ تھوڑی دیر اگر ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں تو اس کی وجہ سے اس کی بڑائی کا احساس ہو گا، اس سے قرب پیدا ہو گا، اس کی بڑائی، اس کی عظمت اور اس کی معرفت حاصل ہو گی اور پھر اس کی اطاعت آسان ہو گی، پھر آہستہ آہستہ اس میں مزہ آنے لگے گا، اولاً تو ہم اللہ پاک کی نعمتوں میں تدبر و تفکر کرتے ہی نہیں، اور اگر ہم کرتے بھی ہیں تو جیسے کرنا چاہئے ویسا نہیں کرتے، جیسے قرآن پاک کے بارے میں ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ بڑی نعمت ہے، لیکن ہمارے ذہنوں میں یہ حقیقت نہیں ہے کہ قرآن پاک تمام نعمتوں پر مقدم ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے وجود اور پیدائش سے بھی مقدم ہے، اسی کی وجہ سے انسان کا وجود قیمتی ہے۔ اسی لئے اسے پیدا کیا گیا ہے، جب یہ اتنی عظیم نعمت ہے تو پھر اس کی کتنی قدر کرنی چاہئے؟ کتنی عزت کرنی چاہئے؟ کتنی عظمت کرنی چاہئے؟ اس کے کیا کیا تقاضے ہیں؟ کن کن تقاضوں پر ہم عمل کر رہے ہیں؟ اور کن پر ہم عمل نہیں کر رہے ہیں؟ عمل نہ کرنے کی صورت میں اس کی کتنی ناقدری اور ناشکری ہو رہی ہے؟ اس ناقدری اور ناشکری کا وبال کیا ہو گا؟ اللہ پاک ہم پر کتنا ناراض ہوں گے؟ اور ہمارے ساتھ کیا معاملہ کریں گے؟ اور سوال و جواب کی صورت میں ہم اللہ پاک کو کیا جواب دیں گے؟ اس طرح آدمی مراقبہ کرے، انشاء اللہ اس سے فائدہ ہو گا۔ اللہ پاک مجھے اور آپ کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

نظامِ عالم کی بقا عدل و انصاف پر ہے:

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ﴿٧﴾ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ﴿٨﴾ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ﴿٩﴾

”اور آسمان کو اسی نے بلند کیا ہے اور اسی نے ترازو قائم کی ہے۔ کہ تم تولنے میں ظلم نہ کرو۔ اور انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو۔ اور تول میں کمی نہ کرو“۔

وضع میزان کی تفسیر میں بعض مفسرین فرماتے ہیں:

آخرت میں اعمال کے وزن کے لئے میزان کو قائم فرمایا۔[1]

حضرت قتادہ اور امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ میزان سے مراد مقدار معلوم کرنے کا آلہ ہے، چاہے وہ ترازو ہو یا گز یا کوئی اور آلہ ہو۔[2]

اور مفسرین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے: میزان کو قائم کیا اور زمین میں عدل و انصاف کو قائم رکھنے کا حکم دیا اور اس کا قیام انبیاء کے ذریعہ وحیِ الٰہی سے ہوا، جس کی وجہ سے نظام کائنات ٹھیک ہو گیا۔[3] اسی وجہ سے ایک حدیث میں ہے:

”بِهٰذَا (اَیْ بِالْعَدْلِ) قَامَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ“[4]

یعنی عدل و انصاف ہی کی وجہ سے آسمان و زمین قائم ہیں۔

دنیا کا نظام، عدل و انصاف پر قائم ہے، عالَم اور کائنات تو بن گئی لیکن اگر اُس میں رہنے والا انسان انصاف کے ساتھ نہیں رہے گا تو نظامِ عالَم درہم برہم ہو جائے گا۔ عالَم کے باقی رہنے کے لئے آدمی کو اپنا پارٹ (Part) ادا کرنا پڑتا ہے، اگر انصاف ہو گا تو پھر یہ نظامِ عالَم صحیح رہے گا۔ اس لیے فرمایا کہ عدل کو قائم کرو۔

---

[1]: تفسیر قرطبی: ۱۷/۱۵۳۔ [2]: تفسیرِ مظہری: ۱/۶۲۸۴۔ [3]: تفسیرِ مظہری: ۱/۶۲۸۴۔ [4]: الجمع بین الصحیحین: افراد: ۱/۴۶۔

صفتِ عدل سے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح:

صفتِ عدل کی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ اور تفصیل بیان کی ہے۔ فرمایا کہ کہ اصل میں عدل ایک ایسا وصفِ انسانی اور ملکہ ہوتا ہے جو سارے نظام دین کی اصل ہے جس سے نظامِ انصاف وجود میں آتا ہے، اس کی وجہ سے گھریلو زندگی ،ملکی معاملات، سیاسیات اور مالی انتظامات اور اخلاق وعادات میں ایک ایسا معتدل اور مفید نظام قائم ہو جاتا ہے جو بالکل اللہ تعالیٰ کی پسند کے موافق ہوتا ہے، جو انسان کو اس دنیامیں بھی اور آخرت میں بھی سعادت نیک بختی سے بہرہ ور کر دیتا ہے۔

چونکہ اس وصف کی حقیقت ہی یہ ہوتی ہے کہ ہر شئی، ہر بات اور ہر عمل کو اس کے صحیح مقام پر رکھا جائے، چاہے وہ اعتقادی ہو یا عملی اور عمل میں دنیاوی ہو یا دینی، اپنی ذات سے متعلق ہو یا دیگر بندوں سے، بڑوں سے متعلق ہو یا چھوٹوں سے، دوستوں سے متعلق ہو یا مخالفین سے حتیٰ کہ خالق سے متعلق ہو یا مخلوق سے۔

اسی وجہ سے شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے، کیونکہ توحید عدل کا تقاضہ ہے یہ اللہ کا حق ہے اور اللہ ہی کیلئے سزاوار ہے، غیر اللہ میں جن صفاتِ کمال کو منسوب کرکے قابل پرستش سمجھا جاتا ہے وہ قطعاً غلط ہیں، اور حق تعالیٰ کی حق تلفی ہے اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو گا؟ غرض یہ وصف ایسے افکار کے وجود میں آنے کا باعث ہوتا ہے۔ جو منشأِ خداوندی کے موافق اور مناسب ہوتے ہیں، اس لئے حق تعالیٰ انسانوں کے امور میں انتظام چاہتے ہیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ انسان آپ میں تعاون کریں، ظلم نہ کریں، جڑے ہوئے رهیں، آپس میں نا اتفاقی نہ کریں، ان کی نسل میں اضافہ ہو ان کے غلط کاروں اور فاسقوں کا مؤاخذہ اور تنبیہ ہو، عدل وانصاف کرنے والوں کی پزیرائی ہو، رسومات فاسدہ

جن کی وجہ سے در اصل لوگ اخلاق وعادات میں توازن کھودیتے ہیں اور جو پورے معاشرے کو تباہ کر دیتے ہیں، ان کو ختم کیا جائے۔ لوگوں میں پاکیزگی اور بھلائی ہمدردی اور سچے اور اچھے جذبات کو پروان چڑھایا جائے۔

یہی وجہ ہیکہ یہ وصف انسان کہ سارے اعمال وافکار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ وصف جب انسان کے احوال یعنی نشست وبرخاست، سونے جاگنے، بول چال میں اور لباس و پوشاک اور وضع قطع میں پایا جاتا ہے اور منشاء الٰہی کے موافق ہوتا ہے تو اس کو شائستگی اور ادب کہا جاتا ہے اور یہی وصف جب مال میں اثر انداز ہوتا ہے یعنی مال کے حاصل کرنے میں جب ظلم وناانصافی سے اور حق تلفی سے بچا جاتا ہے اور خرچ کرنے میں بخل و فضول خرچی سے اجتناب کیا جاتا ہے، توکسب حلال اور کفایت شعاری کہلاتا ہے۔

اور یہی وصف جب گھریلو معاملات میں ظاہر ہوتا ہے اور شریعت میں مقرر کردہ ہر حق کے ادا ہونے کا ذریعہ بنتا ہے تو حریت اور حسنِ معاشرت کہلاتا ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص آزاد ماحول میں سانس لیتا ہے۔ اور یہی وصف جب ملکی معاملات میں داخل ہوتا ہے اور جان و مال اور عزت کی حفاظت میں، نظامِ امن قائم کرنے میں، چوروں ڈاکوؤں ظالموں کو پکڑ کر سزائیں دینے میں اور دشمنوں سے حفاظت میں ظاہر ہوتا ہے تو اس کو اسلامی سیاست کا نام دیا جاتا ہے۔

غرض یہ پورے دین کو حاوی ہے، اس لئے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس کو سعادت کے حصول کے اساسی اوصاف میں شمار فرمایا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کل قیامت میں انسان کے ہر عمل، ہر قول اور ہر عقیدہ کو وزن کرکے دیکھا جائیگا کہ وہ عدل کی کسوٹی میں اترتا ہے یا نہیں، اسی لئے فرمایا:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾[1]

ہم قیامت کے روز ایسی ترازویں لا رکھیں گے جو سراپا انصاف ہوں گی، چنانچہ کسی پر کوئی ظلم نہیں ہو گا، اور اگر کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو گا تو ہم اسے سامنے لے آئیں گے۔ اور ہم حساب کے لئے کافی ہیں۔

اس مضمون کے سمجھانے کے بعد فرمایا کہ ہم نے چونکہ آخرت میں انصاف کا ترازو قائم کیا ہے اس وجہ سے تمہیں بھی دنیا میں اپنا ترازو انصاف کے ساتھ قائم رکھنا ہو گا، فرمایا:

میزان میں خسارہ نہ کریں:

﴿أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ﴾

یعنی جو چیز تولی جا رہی ہے اُس میں کمی نہ کرو۔ دینے کے اعتبار سے بیشی تو کر سکتے ہیں لیکن کمی نہ کرو۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:

”لَا تُخْسِرُوْا اَنْفُسَكُمْ فِي الْمِيْزَانِ، اَيْ لَا تَكُوْنُوْا خَاسِرًا بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِسَبَبِ الْمِيْزَانِ بِاَنْ لَا تَرَاعُوْا مَا يَنْبَغِيْ فِيْهِ“[2]

”تم میزان میں اپنے آپ کا خسارہ مت کرو، یعنی تم خسارہ اٹھانے والے مت بنو قیامت کے دن میزان کی وجہ سے کہ تم ان چیزوں کی رعایت نہ کر سکو جس کو کرنا چاہئے تھا۔“

یہ خسارہ پیدا ہوتا ہے دنیا میں اپنے اقوال، اپنے افعال، اپنے معاملات، حقوق العباد اور حقوق اللہ میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے، عدل قائم نہ کرنے کی وجہ سے۔ اگر ہم اس دنیا میں انصاف نہیں کریں گے تو اللہ پاک کل قیامت میں ہمارے ساتھ انصاف فرمائیں گے، ایک ایک عمل ہمارا دیکھا جائے گا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی ہم

---

[1]: الانبیاء: ۴۷۔ [2]: روح المعانی: ۱۰۲/۲۷۔

نے کوئی عمل کیا ہے تو وہ بھی پیش کیا جائے گا، ہم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا، لیکن جب ہمارے ساتھ انصاف ہوگا، ہمارے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے تو ہم اپنے اعمال بد کی وجہ سے بچ نہیں پائیں گے۔

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾[۱]

"چنانچہ جس نے ذرہ برابر کوئی اچھائی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا، اور جس نے ذرہ برابر کوئی برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا"۔

﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾[۲]

اور اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے، اور تمہارا پروردگار کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ اُس وقت ہمارا نامۂ اعمال باوزن رہنے اور نیکیوں کا پلڑا بھاری رہنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

ترازو کو وزنی رکھنے کی شکلیں:

اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ ان کلمات کا ورد رکھے جو ہم کو نبی علیہ السلام نے سکھلائی ہیں، آپ نے فرمایا کہ دو کلمے زبان پر انتہائی ہلکے ہیں اور اللہ کے ہاں انتہائی محبوب ہیں اور میزان میں انتہائی بھاری ہیں اور وہ یہ ہیں:

"سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ"[۳]

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"سُبْحَانَ اللهِ نِصْفُ الْمِيْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ"[۴]

جو آدمی اخلاص کے ساتھ سبحان اللہ پڑھتا ہے تو وہ آدھے میزان کو بھر دیتا ہے، اور الحمد للہ کہتا ہے تو میزان کو پُر کر دیتا ہے۔

۱: الزلزال: ۷و۸۔ ۲: الکہف: ۴۹۔ ۳: صحیح البخاری: باب قول اللہ تعالیٰ ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ، ۷۵۶۳۔ ۴: مسند احمد: حدیث رجل من بنی سلیم، ۱۸۷۸۱۔

ناپ تول صرف ترازو میں نہیں:

دوسری صورت جو اس سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے اور جس کا اس آیت میں ذکر ہے وہ یہ کہ دنیا میں ہمارا ترازو سیدھا رہے۔ دنیا میں ناپ تول کا نظام بالکل صحیح ہو۔ اس میں انصاف ہو۔اور یہ انصاف اقوال اورافعال دونوں میں ہوتا ہے۔آدمی جب کوئی بات کہے تو ناپ تول کر کہے،اور کوئی کام کرے تو سوچ سمجھ کر کرے۔یہ ہماری عبادات میں بھی ضروری ہے، اخلاقیات میں بھی ضروری ہے،اور معاملات میں بھی ضروری ہے۔

تعلقات کی بقامعاملات کے عدل پر موقوف ہے:

خرید و فروخت میں مختلف چیزوں کی مختلف پیمائش کے جو آلے اور طریقے ہیں وہ سب اسی میں شامل ہیں،کچھ چیزیں عددی ہوتی ہیں،کچھ گز اور میٹر کے حساب سے ناپی جاتی ہیں،کچھ سینٹی میٹر اورفٹ وغیرہ سے ناپی جاتی ہیں،کچھ کسی چیز میں ڈال کر ناپی جاتی ہیں اور کچھ چیزیں تول کر دی جاتی ہیں،وزن میں یہ ساری چیزیں آگئیں،ان کی درستگی سے آپس کا تنفر،دشمنی اور عداوت ختم ہوتی ہے، اور نظام عالَم بالکل صحیح قائم رہتا ہے۔اورآپسی تعلقات باقی رہتے ہیں۔اسلام میں اس کی بڑی اہمیت اور تاکید ہے۔

اگر یہ ترازو کا نظام صحیح نہ ہو تو پھر اس سے معاشرہ میں برائیاں جنم لینے لگتی ہیں،بلکہ اس کی وجہ سے سابقہ امتوں پر عذاب بھی نازل کیا گیاہے،اسی وجہ سے اللہ پاک نے اس کی سخت مذمت کی ہے،اور ایسے لوگوں پر لعنت کی ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ، الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾[1]

''ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں''

جھکتا ہوا تولیں:

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''زِنْ وَاَرْجِحْ''[2]

ناپو اور جھکتا ہوا ناپو، جب کسی کو تول کر دو تو کچھ جھکتا ہوا تول کر دو۔

ایک عجیب واقعہ:

عرب کے ایک شیخ جماعت میں گئے۔ جماعت میں فضائل سے متعلق روایات پڑھی جارہی تھیں، چونکہ ان کے پاس ''ریاض الصالحین'' پڑھی جاتی ہے، اس لئے مذاکرے کے درمیان یہ حدیث ''زِنْ وَاَرْجِحْ'' آگئی۔ شیخ صاحب سونے کے تاجر تھے اور اُن کے چار بیٹے اسی کاروبار میں تھے، اور چاروں کی سونے کی دکانیں تھیں اور چاروں بیٹے تبلیغ میں بھی لگے ہوئے تھے، سب کو سنت پر عمل کرنے کا شوق بھی تھا، شیخ نے اپنے چاروں بیٹوں کو بلایا، اور کہا کہ ہمیں حضور پاک ﷺ کی ایک ایک سنت پر عمل کرنا چاہیے۔ چاروں بیٹوں نے کہا کہ بالکل کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ آج ایک حدیث میں نے سنی ہے۔ بیٹوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ حدیث میں ہے کہ جب تولو تو ذرا جھکتا ہوا تولو۔ یہ سن کر چاروں بیٹوں کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی۔ بیٹوں نے کہا کہ باباجان! بات تو بالکل صحیح ہے

[1]: المطففین: ۱۔۳۔ [2]: سنن ابی داؤد: باب فی الرجحان فی الوزن والوزن بالآجر، ۳۳۳۶۔

مگر ہم لوگوں کا سونے کا کاروبار رہے۔باپ نے کہا کہ بیٹا!بے شک ہمارا سونے کا کاروبار ہے لیکن اللہ کے رسول ﷺ کی بات سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔بیٹوں نے کہا کہ اباجان! اگر یہی بات ہے تو پھر آج سے ہم جھکتا ہوا تولیں گے۔وہ دن اور جس وقت میں نے سنا اُس دن تک وہ روزانہ جھکتا ہوا تولتے تھے اس طرح تولنے کی وجہ سے روزانہ اُنکے سونے میں دوہزار درہم کا سونا زیادہ جاتا تھا، صرف دوہزار درہم حضور پاک ﷺ کی سنت کی اتباع میں وہ لوگ اپنا(loss) نقصان کررہے تھے۔یہ(loss) بھی صرف ہمیں سمجھانے کے لیے ہے حالانکہ اصل کمائی یہی (loss) ہے۔ناپ تول میں کمی کرنے کی وجہ سے ہمارا دنیوی کوئی فائدہ نہیں ہے، ہم اس میں فائدہ سمجھ کر کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ نقصان ہی ہوتا ہے۔

اس لئے ہم کاروبار کریں تو شریعت کے مطابق کریں، ہمارا ہر قول، ہر عمل اور ہر فعل شریعت کے حدود میں ہو، تبھی کل قیامت میں ہمارا ترازو صحیح ہو گا، ہمارا نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گا۔

زمین مخلوق کے لئے بچھائی گئی:

”وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾

”اور اسی نے خلقت کے لئے زمین بچھائی، اس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں جن کے خوشوں پر غلاف ہوتے ہیں، اور اناج جس کے ساتھ بھس ہوتا ہے اور خوشبودار پھول، تو (اے گروہ جن وانس!) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“؟

"اَنام" مخلوق کو کہتے ہیں، مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد انسان اور جنات ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ تمام جاندار مراد ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صرف بنو آدم مراد ہیں۔[۱]

ارض و سماء کے درمیان میزان کے ذکر کی حکمت؟

اللہ پاک نے آسمان کے بالمقابل زمین کا تذکرہ کیا ہے کہ اس نے اپنی قدرت سے آسمان کو بلند اور اونچا بنایا اور زمین کو بچھایا، درمیان میں میزان کا ذکر اس حکمت سے کیا ہے کہ آسمان و زمین کی بقا عدل و انصاف پر موقوف ہے اور عدل و انصاف کی بنیاد ہی پر ان میں امن و امان قائم رہ سکتا ہے۔

زمین اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور یہ ساری مخلوق کے لئے نعمت ہے، لیکن اگر انام سے خاص طور پر انسان مراد ہے تو پھر اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان اس سے جتنا نفع اُٹھاتا ہے کوئی دوسرا نہیں اُٹھاتا۔

کیونکہ کہتے ہیں کہ "الإنسان ينتفع بها وبما فيها وبما عليها"

انسان خود زمین سے فائدہ اُٹھاتا ہے، زمین کے اندر کی چیزوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور زمین کے اوپر والی چیزوں سے بھی فائدہ اُٹھاتا ہے جبکہ دوسری مخلوقات اس طرح فائدہ نہیں اٹھاتیں۔

زمین سے دوسری مخلوقات بھی فائدہ اُٹھاتی ہیں، لیکن اندر سے لے کر باہر تک جس کو نچوڑنا کہتے ہیں یہ صرف آدمی ہی کرتا ہے۔

﴿فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ﴾

اُس میں میوے بھی ہیں اور اُس میں کھجور بھی ہیں، جن پر باضابطہ غلاف بھی ہوتا ہے۔ جن کی وجہ سے کھجوروں کی حفاظت ہوتی ہے۔

---

[۱] : روح المعانی: ۱۲۰/۲۰۔

فاکہہ اور نخل کا مصداق:

آدمی جو چیزیں کھاتا پیتا ہے وہ تین طرح کی ہوتی ہیں۔بعض وہ چیزیں ہوتی ہیں جو صرف لذت کیلئے کھائی جاتی ہیں جن سے پیٹ بھرنا مقصود نہیں ہوتا اُس کو عربی میں"فاکہہ"کہتے ہیں۔اکثر پھل وغیرہ پیٹ بھرنے کی نیت سے نہیں کھائے جاتے بلکہ پیٹ بھرنے کے بعد مزے کیلئے کھائے جاتے ہیں۔بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو بھوک کی حالت میں غذا کے لئے اور اگر بھوک نہ ہو تو صرف مزہ کے لئے کھائی جاتی ہیں، جیسے کھجور، اس کو"فاکہہ"کے طور پر بھی کھایا جاتا ہے اور غذا کے طور پر بھی کھایا جاتا ہے۔عرب میں جب بھوک لگتی تھی تو کھجور کھالیا کرتے تھے اور آج عرب میں کھجور کھانا کھانے سے پہلے یا بعد میں کھانے کے لئے رکھ دیئے جاتے ہیں۔

تیسری وہ چیزیں ہوتی ہیں جس کو صرف غذا کے لئے کھایا جاتا ہے، تلذذ کے طور پر نہیں، جیسے غلّے جن میں دال، چنا، چاول گیہوں جَو وغیرہ ہیں، عام طور پر جتنی چیزیں غلے کی قبیل سے ہوتی ہیں وہ فاکہہ کے طور پر نہیں بلکہ غذا کے طور پر کھائی جاتی ہیں۔اور تینوں طرح کی چیزیں اس میں شامل ہیں، چاہے وہ غذا کے طور پر کھائی جاتی ہوں، یا تلذذ کے طور پر کھائی جاتی ہوں، یا کبھی تلذذ اور کبھی تغذی کے لئے کھائی جاتی ہوں۔اور اللہ پاک نے اسی ترتیب کے اعتبار سے یہاں ان کا ذکر کیا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ایسے کھجور بنائے ہیں جو"ذَاتُ الْاَکْمَامِ"خوشے دار اور غلاف دار ہیں۔

بھوسہ کے فوائد:

﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ﴾

اور (اس میں) غلہ ہے جس میں بھوسہ (بھی) ہوتا ہے، اور (اس میں) غذا کی چیز (بھی) ہے (جیسے بہت سی ترکاریاں وغیرہ)۔

---

[1]: روح المعانی:۲۰/۱۲۲۔

اللہ پاک کی نعمتوں میں سے ایک نعمت غلوں کا بھوسہ دار اور خوشبودار ہونا ہے۔غلّہ بھی ایک نعمت ہے اور غلّے کے ساتھ بھوسہ بھی ایک نعمت ہے۔ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی نعمت نہیں ہے اور اسی وجہ سے ہم اس کو پھینک دیتے ہیں، حالانکہ یہ بھی بڑی نعمت ہے۔

(۱) تحقیق سے معلوم ہوا کہ بھوسے والی روٹی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔

(۲) بھوسہ سے غلہ کی حشرات الارض: مکھی، مچھر، دھول اور گندگیوں سے حفاظت ہوتی ہے۔

(۳) بھوسہ ہمارے جانوروں کی غذا ہے، جن کا دودھ ہم استعمال کرتے ہیں، اور جن پر باربرداری کرتے ہیں، اور جن سے کئی فوائد ہم حاصل کرتے ہیں، اور یہ جانور ہمارے لئے ہی مسخر ہیں تو گویا بھوسہ بھی ہمارے لئے ہی نعمت ہوا۔

اس کے بعد ریحان کا لفظ ہے، ریحان کے ایک معنٰی خوشبو کے ہیں، جس میں تمام قسم کی خوشبوئیں شامل ہیں۔[۱] اسی طرح وہ رنگ برنگے پھول بھی اسی میں داخل ہیں جن جن کو دیکھ کر آدمی کو سرور حاصل ہوتا ہے اور جن کی خوشبوؤں کو سونگھ کر دل و دماغ معطر اور باغ باغ ہوجاتا ہے۔

ریحان کے ایک معنٰی مغز اور رزق کے ہیں، ابن عباسؓ نے رزق ہی کے معنٰی مراد لئے ہیں۔[۲]

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾

سوائے جن و انس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

لفظِ ''آلاءِ'' کی تحقیق:

لفظ ''آلاءِ'' کے معنی نعمت کے ہیں،[۳] مطلب یہ ہے کہ اے جن و انس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اس کے ایک اور معنٰی قدرت اور نشانی

۱: تفسیرِ طبری: ۲۲/ ۲۰۔ ۲: روح المعانی: ۲۰/ ۱۲۲۔ وتفسیر طبری۔

۳: تفسیر ابن کثیر: ۷/ ۴۹۱ والقاموس الوحید۔

کے بھی ہیں۔[۱] اب اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ”اے جنات اورانسان! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نشانیوں اور کون کونسی قدرت کو ٹھکراؤ گے؟“ یہ معنیٰ بھی صحیح ہے، عام طور پر مفسرین نے اس کا ترجمہ نعمت ہی سے کیا ہے، نیز علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض آیات میں نعمت کے بجائے قدرت کی صراحت کی ہے، اس وجہ سے علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ جس مقام پر جو معنیٰ مناسب وموزوں ہوں وہ اختیار کئے جاسکتے ہیں۔[۲]

صفتِ ”رب“ کے ذکر کی وجہ:

اس آیت میں اللہ پاک نے ”ربّ“ کا ذکر فرمایاہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں در اصل احسان میں مبالغہ مقصود ہے، کہ وہ ذات جو تمہاری پالنہار ہے، منعم ہے، محسن ہے، اور جو تمہیں پال رہی ہے اُس کی کن کن چیزوں کو اور کن کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟ جب تم جھٹلا نہیں سکتے تو اس کے فرمانبردار بن جاؤ۔

خطاب میں تثنیہ کا صیغہ کیوں؟

”تکذبان“، تثنیہ کا صیغہ ہے، اللہ پاک نے یہاں تثنیہ کا صیغہ کیوں استعمال فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خطاب انسان اور جنات دونوں سے ہے، اس لئے یہاں تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ جیسا کہ آگے مستقلاً دونوں کا ذکر آرہا ہے، اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے۔[۳]

﴿فبأی آلاء ربکما تکذبان﴾ کا جواب:

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان جلوہ افروز ہوئے اور سورۂ رحمن کی تلاوت فرمائی۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم غور سے سنتے رہے۔ جب آپ تلاوت سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب میں نے جنات پر اس سورت کی تلاوت کی تھی تو اس کا اثر

۱: تفسیرِ طبری:۲۲/۲۳۔ ۲: تفسیرِ عثمانی:۵۹۵۔ ۳: تفسیرِ قرطبی:۱۷/۱۳۸۔

تمہارے مقابلہ میں ان پر زیادہ ہوا، تم تو خاموش رہے لیکن انہوں نے اس کا بڑا اچھا جواب دیا۔ پھر اُس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب میں ﴿فبأی آلاء ربکما تکذبان﴾ کہتا تو وہ کہتے: ”لَا بِشَیْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ“[1] ”اے پروردگار! ہم آپ کی کسی نعمت کی تکذیب اور ناشکری نہیں کریں گے، آپ ہی کے لئے حمد ہے“۔ اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ جب کوئی ”فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ“ سنے تو اُس وقت زبان سے یا کم از کم دل میں یہ الفاظ کہہ لے۔

نعمتوں کی تکذیب کی صورتیں:

علماء نے فرمایا ہے کہ نعمتوں کے جھٹلانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت ہونے کا ہی اقرار نہ کیا جائے یعنی عدمِ اعترافِ نعمت، جیسے مخلوق کا ایک بڑا حصہ قرآن پاک کو نعمت ہی نہیں سمجھتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ نعمت کا اعتراف تو کیا جائے، لیکن اس میں غیر اللہ کو بھی شریک سمجھا جائے، یا بذاتِ خود اسی کو مقصود اور معبود سمجھ لیا جائے، جیسے سورج و چاند کے نعمت ہونے کا احساس ہے، یہ احساس مسلمان کو بھی ہے اور غیر مسلم کو بھی ہے، لیکن غیر مسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اس کو بھی مقصود اور معبود سمجھتے ہیں، ان نعمتوں کو نعمت ہی کی حد تک رکھنا چاہئے ان کو معبود نہیں بنانا چاہئے، یہ بھی تکذیب کی ایک صورت ہے۔

اور کبھی تکذیب صراحۃً ہوتی ہے، اور کبھی دلالۃً۔ صراحۃً کا مطلب یہ ہے کہ کھلم کھلا کسی کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے، یا دین کے کسی بدیہی اور ضروری امر کا انکار کیا جائے، دلالۃً کا مطلب یہ ہے کہ انعامات اور احسانات کی وجہ سے جو تعلق اللہ

---

[1] سنن ترمذی: کتاب التفسیر: باب ومن سورۃ رحمن، ۵/۳۹۹۔

تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہیے وہ غیر اللہ کے ساتھ کیا جائے۔ آدمی زبان سے تو خلاف شرع کوئی بات نہ کہے لیکن اس کا عمل شریعت کے خلاف ہو، بعض دفعہ آدمی زبان سے کہتا نہیں ہے لیکن کرتا وہی ہے جو جھٹلانے والا کرتا ہے، یہ بھی تکذیب کی ایک صورت ہے۔ اللہ پاک ان سب سے ہماری حفاظت فرمائے۔ (آمین)

سورۂ رحمٰن کی تین بنیادی نعمتیں:

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۱۶﴾

”اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا، اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا تو تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ رحمٰن میں تین طرح کے مضامین بیان فرمائے ہیں اور وہ تینوں بڑی نعمتیں ہیں۔

(۱) ایک تو جسمانی، مادّی، دنیاوی اور روحانی اعتبار سے نعمتوں کا بیان ہے۔

(۲) قیامت میں گنہگاروں کی سزا کا بیان ہے۔ یہ بھی اللہ پاک کی بہت بڑی نعمت ہے۔

(۳) تیسرے ان نعمتوں کا ذکر ہے جو آخرت میں اہلِ جنت کو دی جائیں گی۔

اس آیت میں اللہ پاک نے جسمانی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا:

حضرتِ آدم علیہ السلام کی تخلیق:

”خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ“

”اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا“

"صَلْصَالٍ" اس پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں جو خشک ہو جائے، اور فخار وہ پانی میں ملائی ہوئی مٹی جس کو آگ پر پکایا گیا ہو۔[۱]

یہاں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔[۲]

اللہ تعالیٰ نے چند مخصوص چیزوں کو اپنی طرف منسوب فرمایا، جس میں سے ایک حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اللہ پاک نے فرمایا کہ اُن کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کا پتلا بنانے کے لیے پہلے زمین کے اجزاء منگوائے اور زمین کی مختلف جگہوں سے کچھ مٹی لے کر حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کی ۔[۳]

زمین اور فرشتوں کا مکالمہ:

مفسرین نے اس کی کچھ اور تفصیل بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ پاک نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو زمین پر بھیجا کہ اس میں سے کچھ مٹی لے آؤ، وہ مٹی لینے کے لئے آئے تو زمین نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں کہ مجھ میں سے کوئی حصہ کم ہو جائے، حضرت جبرئیل لوٹ گئے اور کچھ نہیں لیا، پھر اللہ پاک نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو بھیجا، ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، پھر اللہ پاک نے ملک الموت کو بھیجا، زمین نے ان سے بھی یہی کہا تو انہوں نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں اس کے حکم کی مخالفت کروں، پھر انہوں نے زمین سے کچھ مٹی لی، کچھ لال، کچھ کالی، کچھ سفید، پھر اس کو ملا دیا اور اللہ پاک کے یہاں پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چونکہ انسان کی پیدائش مختلف رنگ کی مٹی سے ہوئی اس لئے اس کے رنگ بھی مختلف ہیں۔[۴]

۱: تفسیرِ طبری:۷/۱۸۱۔ ۲: تفسیرِ طبری:۷/۱۸۱۔ ۳: سنن ابی داؤد: باب فی القدر، ۴۶۹۳۔ ۴: تفسیر مظہری:۱/۱۷۹۔

بعض روایات میں ہے کہ پھر اللہ پاک نے ابلیس کو بھیجا تو وہ زمین سے میٹھا اور کڑوا پانی لایا، اللہ پاک نے اس کو مٹی میں ملا کر آدم علیہ السلام کو بنایا تو ان کے اخلاق بدل گئے، جس کی پیدائش کڑوے پانی سے ہوئی ہو گی وہ شقی ہو گا، اور جہنّم میں جائے گا، اور جس کی پیدائش میٹھے پانی سے ہوئی ہو گی وہ سعید ہو گا۔ اور جنت میں جائے گا۔[1]

ایک اشکال اور اس کا جواب:

انسان کی پیدائش کا اللہ پاک نے مختلف مقامات پر مختلف انداز میں ذکر فرمایا ہے، کہیں فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾[2]

"اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں"

کہیں فرمایا: ﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ﴾[3]

"ہم نے انہیں چپکتے ہوئے گارے سے بنایا ہے"

کہیں ارشاد ہے: ﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ یَّخْرُجُ مِنْۢ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآىِٕبِ﴾[4]

"وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا ہے، جو پیٹھ اور سینے کے بیچ سے نکلتا ہے"

کہیں فرمایا: ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾[5]

اس نے (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جاؤ تو وہ (انسان) ہو گئے۔

اور کہیں ہے: ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ﴾[6]

"کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے نہیں پیدا کیا"؟

بظاہر ان آیات کو دیکھنے سے تعارض معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کہیں پیدائش کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ماءِ مہین سے ہوئی، کہیں کہا گیا کہ مٹی سے ہوئی، کہیں کہا گیا

---

[1]: الدر المنثور: ۱/۱۱۷۔ [2]: الحجر: ۲۸۔ [3]: الصافات: ۱۱۔ [4]: الطارق: ۶و۷۔ [5]: آل عمران: ۵۹۔ [6]: المرسلات: ۲۰۔

کہ کھنکھناتی مٹی سے ہوئی۔ لیکن اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے کیونکہ جب انسان کی پیدائش کا اللہ پاک نے ارادہ کیا تو پہلے مٹی لی، اس کے بعد اس کو گوندا تو طین (کیچڑ) ہو گیا، پھر وہ منتقل ہو کر حمأ مسنون (سڑا ہوا گارا) ہوا، پھر اور سوکھ کر "صلصال کالفخار" (کھنکھناتے ٹھیکرے) کی طرح ہو گیا۔ پھر ان کی اولاد کا سلسلہ ماءِ مہین (حقیر پانی) سے جاری ہوا۔[۱] اس لئے انسان کی پیدائش کو سب کی طرف منسوب کیا گیا۔

انسان کی تخلیق کے مراحل:

پھر اس سے آگے کے مراحل کا ذکر کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾[۲]

اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں کچھ شک ہو تو (ذرا سوچو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر ایک جمے ہوئے خون سے، پھر ایک گوشت کے لوتھڑے سے، جو کبھی پورا بن جاتا ہے اور کبھی پورا نہیں بنتا۔

یہ مٹی جس کے ذریعہ نباتات کی شکل میں انسان کو غذا ملتی ہے اس سے نطفہ یعنی مادۂ منویہ پیدا ہوتا ہے، جو ایک ذلیل پانی ہوتا ہے، وہ اگر کپڑے اور جسم کو لگ جائے تو اُس کو دھونا ضروری ہوتا ہے۔ جب وہ جسم سے خارج ہوتا ہے تو آدمی اُس سے نفرت کرتا ہے، اس کی طبیعت میں ایک قسم کا انقباض اور تکدر پیدا ہوتا ہے بلکہ پوری روح اُس سے مکدر ہو جاتی ہے، اس لیے اس کے خارج ہونے پر غسل فرض ہو جاتا ہے۔ غسل کرتے ہی آدمی میں بشاشت واپس آجاتی ہے، اور اس کا سارا اضمحلال، تکدر اور انقباض ختم ہو جاتا ہے، پھر وہ ناپاک نطفہ خون کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے، پھر خون

۱: تفسیر قرطبی: ۱۲۶/۲۰۔ ۲: الحج: ۵۔

گوشت کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر گوشت کے بعض اجزاء میں ہڈی پیدا کی جاتی ہے، پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے،اس طرح پورا جسمانی نظام قائم ہوتا ہے۔ پھر جتنے دن اللہ پاک اس کو رحمِ مادر میں رکھنا چاہیں وہ رہتا ہے، پھر اس کی ولادت ہوتی ہے۔ کیسی اس کی قدرت ہے؟ کیسی اس کی خالقیت ہے؟ کیسی اس کی ربوبیت ہے کہ اس نے ایک ناپاک پانی کو انسانی سانچہ میں ڈھال دیا، یہ تو بنی آدم کا نظام ہے، لیکن حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا نظام تو بالکل الگ تھا۔ اُن کو براہِ راست مٹی سے بنایا گیا، اس کو سکھایا گیا اور اس سوکھی ہوئی مٹی میں دل، دماغ، پھیپھڑے، گُردے، گوشت، پوست، خون، نسیں، ہڈیاں سب پیدا کی گئیں۔

انسان عالم اصغر ہے:

اس ناپاک قطرے کے لئے اللہ پاک نے سارے عالم کو مسخر کیا۔ پہلے اللہ پاک نے عالمِ اکبر یعنی آسمان و زمین، چاند اور سورج اور اللہ کی وحدانیت پر دال چند چیزوں کا ذکر کیا۔ اب عالمِ اصغر یعنی انسان کو بیان فرمارہے ہیں۔

انسان کی سارے عالموں پر افضلیت کی وجوہات:

بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ انسان عالمِ اکبر ہے اور ساری چیزوں سے افضل ہے۔ اور تمام کائنات عالمِ اصغر ہے کیونکہ جو کچھ کائنات میں ہے وہ آدمی میں ہے، لیکن جو کچھ اس میں ہے وہ پوری کائنات میں نہیں ہے۔ آدمی میں کچھ چیزیں غیر معمولی ہیں، اس لیے پوری کائنات اس کے لئے مسخر ہے اور آدمی مسخر لہ ہے۔ کائنات پوری مستعمَل یعنی استعمال کی جانے والی ہے اور آدمی مستعمِل یعنی استعمال کرنے والا ہے۔ کائنات میں اختیار نہیں ہے جبکہ آدمی میں اختیار ہے۔ کائنات میں عقل

ودانش نہیں ہے لیکن آدمی میں عقل ودانش ہے۔کچھ عقل و دانش دوسری مخلوقات میں بھی ہے لیکن اتنی نہیں کہ ان کو اللہ کا کلام دیا جاسکے۔ اور وہ احکامِ شرع کے مکلف ہوسکیں، اور اُن کو آزمائش میں ڈالا جاسکے۔

تخلیق کے ذکر کا مقصد:

اسی عقل و دانائی کی بنیاد پر اس نے دوسری مخلوقات کو اپنا کھلونا بنالیا ہے، جیسے چاہے ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے، حالانکہ یہ اس مٹی سے بنا ہوا ہے جس کو روندا جاتا ہے، جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ان سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کو ساری مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے، وہ پوری مخلوقات پر حکومت کرتا ہے، نباتات اس کی خدمت میں، جمادات اس کی خدمت میں، حیوانات اس کی خدمت میں۔ پہاڑ، دریا، زمین، درخت، اور جانور سب اس کے ماتحت اور تصرف میں ہیں، سب کو اسی کے لئے مسخر کیا گیا، لیکن ساتھ ہی اسے یہ حقیقت بھی بتا دی گئی کہ تمہاری حقیقت یہ ہے، تاکہ انسان اپنی حقیقت میں غور کرے، اپنے نظامِ پیدائش پر غور کرے کہ کس چیز سے اس کو پیدا کیا گیا ہے؟ اور کیسے وہ پیدا ہوا ہے؟ کن کن مراحل سے اس کو گزارا گیا ہے؟ تاکہ وہ اپنے خالق اور رب کو پہچان سکے۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا: ﴿فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾[1]

اب انسان کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اسے کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟

جنات کی تخلیق:

﴿وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ﴾

اور جنات (کی اصل اول) کو خالص آگ سے پیدا کیا۔

---

[1] الطارق:۵۔

جان سے مراد ابلیس ہے اور وہ جنات کا باپ ہے۔ لیکن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ جنات کا باپ تو ہے لیکن ابلیس نہیں ہے۔[۱]

"مارج" کے معنیٰ ہیں بھڑکتی ہوئی آگ یا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو، اور اس کے ایک معنیٰ خلط ملط کے بھی آتے ہیں، چونکہ آگ کے زرد، سرخ اور سبز شعلے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں اس لئے اس کو مارج کہتے ہیں۔[۲]

بعض روایات میں ہے کہ اللہ پاک نے دو آگ پیدا کی، پھر ان کو ملایا تو ان میں سے ایک نے دوسری کو کھالیا، یہی نارِ سموم ہے، اس سے ابلیس کو پیدا کیا گیا۔[۳]

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سموم جہنم کی آگ کا سترّواں حصہ ہے۔[۴]

خلاصہ یہ کہ خالص آگ جس میں دھواں شامل نہ تھا اُس سے جنات کی اصل ابوالجن کو پیدا کیا گیا۔ پھر اُس کے بعد اُن میں توالد وتناسل کا سلسلہ شروع ہوا، جیسے انسان کی اصل حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا، پھر ان کی اولاد میں توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہوا۔

جنات کا ثبوت قرآن اور احادیث سے

جنات کے بارے میں لوگوں میں کافی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اس لئے ان سے متعلق بھی چند باتیں ذہن میں رکھیں ۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ اس آیت سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنات ہیں ان کا انکار قرآن کا انکار ہے۔

۱: روح المعانی: ۲۰/ ۱۲۵۔ ۲: تفسیر طبری: ۲۲/ ۲۵۔ ۳: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/ ۱۴۰۔ ۴: الدر المنثور: ۵/ ۷۸، تحت قولہ قولہ والجان خلقناہ من قبل من نار السموم۔

اسی طرح سورۂ حجر میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴾[1]

"اور جنات کو ہم نے اس سے پہلے لُو کی آگ سے پیدا کیا تھا۔"

سورۂ اعراف میں ہے: ﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾[2]

(شیطان نے کہا کہ) آپ نے مجھ کو آگ سے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا (تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟)

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُّوْرٍ وَخُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَّارِجٍ مِنْ نَّارٍ"[3]

ملائکہ کو نور سے پیدا کیا گیا، اور جنات کو بھڑکتے ہوئے شعلہ سے پیدا کیا گیا۔

جنات کی ذریت کا سلسلہ:

(۲) دوسرے یہ کہ ان میں توالد وتناسل ہوتا ہے، یعنی اُن میں بھی اولاد کا سلسلہ انسانوں جیسا ہوتا ہے۔ "هُمْ يَتَوَالَدُوْنَ كَمَا يَتَوَالَدُ بَنُوْ آدَمَ"[4]

نیز اسی سورت میں آگے اللہ پاک نے حوروں کے بارے میں فرمایا: ﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ کہ ان کو اس سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا (جماع کیا) ہے اور نہ کسی جن نے، پتہ چلا کہ ان میں بھی آپس میں انسانوں جیسا تعلق اور صحبت ہوتی ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ عام طور پر وہ انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ اور عام طور پر اس لیے کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی کسی کو نظر بھی آجاتے ہیں۔

۱: الحجر: ۲۷۔ ۲: الاعراف: ۱۲۔ ۳: صحیح مسلم: باب فی احادیث متفرقۃ، ۷۶۸۷۔ ۴: تفسیر طبری: ۱/۵۰۶۔

جنات کا کسی کی شبیہ اختیار کرنا:

(۴)چوتھی بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی شکل کو اختیار کرسکتے ہیں، اللہ تعالی نے ان کواس کی قدرت دی ہے۔ انسان میں کثافت ہوتی ہے، اور جنات میں لطافت ہوتی ہے، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی شکل کو اختیار کرسکتے ہیں۔

جنات حضور ﷺ کی شکل میں متشکل نہیں ہوسکتے:

البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ ہے، وہ حضور ﷺ کی شکل میں نہیں آسکتے، نہ خواب میں اور نہ بیداری میں۔ آپ نے فرمایا:

"مَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَۃِ أَوْ لَکَأَنَّمَا رَآنِیْ فِی الْیَقْظَۃِ لَا یَتَمَثَّلُ الشَّیْطَانُ بِیْ"[۱]

جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو گویا اس نے مجھے بیداری میں دیکھا، کیونکہ شیطان میری شکل اختیار نہیں کرسکتا۔

کیونکہ اگر ان کو اس کی قوت ہوتی تو لوگوں میں دھوکہ دہی کا اندیشہ ہوتا، اس لئے جو اَشکال دین کے اعتبار سے نقصان پہنچانے والے ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن کو وہ شکل اختیار کرنے کی قدرت ہی نہیں دی۔ البتہ دوسرے اَشکال میں جنات کسی بھی وقت متشکل ہوسکتے ہیں۔ جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں زکوۃ کے مال کی حفاظت کے لئے مقرر کیا تھا، شیطان رات میں فقیر اور محتاج بن کر آیا اور کچھ مال چرا کر لے گیا، دوسرے دن آپ ﷺ نے اس کی نشان دہی فرمائی کہ وہ شیطان تھا۔[۲]

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مدینہ میں کچھ جنات اسلام لائے ہیں، اگر تم ان کو پکڑو تو تین دن تک قتل مت کرو، ان کو جانے کے لئے کہو، اگر وہ پھر بھی نہ

۱: صحیح مسلم: باب قول النبی ﷺ من رآنی فی المنام، ۶۰۵۷۔ ۲: صحیح بخاری: کتاب الوکالۃ، ۲۳۱۱۔

جائیں تو اس کے بعد اگر تم قتل کرنا چاہو تو قتل کردو، کیونکہ وہ شیطان ہے۔[۱] ان روایات سے پتہ چلا کہ وہ انسان کی اور جانوروں کی شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔

کیا جنات احکام شرع کے مکلف ہیں؟

(۵) ایک بات ان سے متعلق یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جنات میں بھی کچھ مؤمن ہوتے ہیں اور کچھ کافر، کچھ اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے، قرآن پاک کی ایک مستقل سورت سورۃ الجن ان ہی کے نام سے ہے۔ اس میں ان کے قرآن پاک کو سن کر اسلام لانے اور کفر و شرک سے برأت کا ذکر ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ میں کچھ جنات اسلام لا چکے ہیں۔[۲]

اُن میں بھی رُشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا نظام ہے۔ وہ بھی احکام شرع کے مکلف ہیں، انسانوں کے پاس آکر وہ بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، سے لے کر آج تک ان میں یہ نظام ہے۔

حضور نے جنات میں بھی تبلیغ فرمائی:

آپ ﷺ کا متعدد مرتبہ جنات کے پاس جانا اور ان میں تبلیغ فرمانا ثابت ہے۔ احادیث میں ہے کہ ایک رات ایک جن آپ کو بلانے کے لئے آیا اور آپ ﷺ اس کے ساتھ تشریف لے گئے، وہاں جاکر ان کے مجمع میں قرآن سنایا، جب آپ واپس جانے لگے تو ان لوگوں نے روزی کا سوال کیا تو آپ نے اللہ سے دعا کی، اور پھر فرمایا کہ جس ہڈی پر اللہ کا نام لیا جائے گا وہ تمہاری غذا ہوگی، اور پہلے کے بالمقابل اس پر اور زیادہ گوشت چڑھا دیا جائے گا- چونکہ وہ ان کی غذا ہے اس لئے آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ہڈی اور گوبر سے استنجاء مت کیا کرو کیونکہ وہ تمہارے بھائی جنات کی غذا ہے۔

۱: صحیح مسلم: باب قتل الحیات وغیرھا، ۵۹۷۶۔ ۲: صحیح مسلم: باب قتل الحیات وغیرھا، ۵۹۷۶۔

اور فرمایا کہ ہمارے جانوروں کی لید تمہارے جانوروں کا چارہ ہو گا۔[۱]

معلوم ہوا کہ وہ بھی احکامِ شرع کے مکلف ہیں، وہ بھی آپ ﷺ کے امتی ہیں، ایک جگہ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ﴾[۲]

''ہم نے بہت سے انسان اور جنات کو جہنّم کے لئے پیدا کیا''۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ﴾[۳]

یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں جنات اور انسانوں کے ان گروہوں سمیت جو ان سے پہلے گزرے ہیں، عذاب کی بات طے ہو چکی ہے۔

سورۂ احقاف میں ہے:

﴿وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ، قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ، يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾[۴]

اور اے پیغمبر! یاد کرو جب ہم نے جنات کے ایک گروہ کو تمہاری طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں، چنانچہ جب وہ وہاں پہونچے تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کے پاس انہیں خبر دار کرتے ہوئے واپس پہونچے۔ انہوں نے کہا کہ اے ہماری قوم کے لوگو! یقین جانو! ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق

۱: صحیح مسلم: باب الجہر بالقراءۃ فی الصبح...۱۱۳۵۔ ۲: الاعراف: ۱۹۱۔ ۳: الاحقاف: ۱۸۔ ۴: الاحقاف: ۲۹و۳۰و۳۱۔

کرتی ہے، حق بات اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اے قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی بات مان لو، اور اس پر ایمان لاؤ، اللہ پاک تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا، اور تمہیں ایک دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔

ان نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی احکام کے مکلف ہیں، ان کے لئے بھی دین کی تعلیمات ہیں، اور آپ ﷺ ان کے بھی نبی ہیں، ان کے لئے بھی سزا کا نظام ہے۔ اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ انسانوں کے بھی نبی ہیں اور جنات کے بھی نبی ہیں۔ اگر وہ احکامِ شرع کے مکلف نہیں ہیں تو ان کے اسلام لانے کا کیا مطلب؟ ان کے کفر وشرک سے برأت کا کیا مطلب؟ اور ان کے لئے سزا اور جزا کا نظام کیوں ہے؟

کیا جنات جنت میں داخل ہوں گے؟

(۶) ان نصوص سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان میں بھی تبلیغ کا نظام ہے، اور وہ بھی احکامِ شرع کے مکلف ہیں اور سزائیں ان کے لئے بھی ہیں، اور خطاب ان سے بھی ہے تو سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ آخرت میں جنت میں جائیں گے یا نہیں؟ تو علامہ بدر الدین شبلی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ علماء کے اس سلسلہ میں چار قول ہیں:

(۱) مومن جنات جنت میں داخل ہوں گے۔ اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے، اور اسی قول کو ہم اختیار کرتے ہیں۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ جنات جنت میں داخل نہ ہوں گے اس کے باہر ہی دروازوں کے قریب رہیں گے انسان انہیں دیکھ لیا کریں گے وہ انسانوں کو نہ دیکھیں گے۔ (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اعراف میں رہیں گے اور اس بارے میں انہوں نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے۔ (۴) چوتھا قول توقف کا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے اس کا کوئی فیصلہ نہیں کریں گے، بلکہ خاموش رہیں گے۔[1]

---

[1] آکام المرجان: الباب الرابع والعشرون فی دخول مؤمنیھم الجنۃ: ۱/ ۹۲۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

جنات کے بارے میں مستقل احکام نہ ملنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ جنات کی طرف رسول نہیں بھیجے گئے، اور دین ان کیلئے نہیں ہے۔ آج میں نے امین اصلاحی صاحب کی "تدبر قرآن" دیکھی، یہ صاحب بھی مودودی صاحب سے متأثر ہیں۔ یہ عالم تو ہیں لیکن فکر مودودی صاحب والی تھی۔ جب میں نے فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ کی تفسیر دیکھی تو انہوں نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ نبی ﷺ جنوں کے پیغمبر نہیں تھے۔ (نعوذ باللہ) یہ بات قرآن و حدیث اور عقیدۂ اہل السنۃ والجماعۃ کے صریح خلاف ہے۔

حالانکہ دین ان کے لئے بھی ہے، چونکہ ان کی تبلیغ اور تعلیم کا نظام ہمارے سامنے نہیں ہے، اور باضابطہ مردوں جیسا انہیں احکام کا مخاطب نہیں بنایا گیا، اس وجہ سے یہ شبہ پیدا ہو گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جنات انسانوں کے تابع ہیں، اس لئے جب متبوع کا ذکر آ گیا تو اب تابع کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

جیسے قرآن کریم میں جہاں مسائل کا بیان ہے تو وہاں عموماً مرد مخاطب ہیں، مردوں کے صیغے سے خطاب کیا گیا ہے، عورتوں کا بیان نہیں ہے، کیونکہ عورت مرد کے تابع ہے اس لیے مرد سے جب یہ کہا گیا کہ نماز پڑھو تو عورت بھی اس میں شامل ہو گئی۔ مرد کو کہا گیا کہ روزہ رکھو تو عورت بھی اس میں شامل ہو گئی، البتہ کہیں کہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں بھی مخاطب بنایا ہے، لیکن عموماً احکام میں مستقل طور پر ان کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح جنات بھی تابع ہیں، اس لئے باضابطہ ان کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔

دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ انبیاء کے بارے میں قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ وہ ان ہی کی قوم میں سے آتے ہیں، اور جنات کی قوم انسان سے الگ ہے، اس لئے انبیاءِ کرام ان کے لئے مبعوث نہیں ہوتے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی ضابطہ نہیں کہ مخلوق کی ہر نوع کے لئے اسی نوع کا کوئی شخص رسول ہوا کرے۔ باقی انسانوں کی طرف فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجنے سے جو قرآن کے متعدد مواضع میں انکار کیا گیا ہے، اس کا اصلی منشاء یہ ہے کہ عام انسان ان کی اصلی ہیئت میں ان کی رویت کا تحمل نہیں کر سکتے اور خوف وہیبت کی وجہ سے ان سے مستفید نہیں ہوسکتے اور اگر وہ بصورتِ انسان آئیں تو بے ضرورت التباس رہتا ہے۔ اسی طرح اگر جنات کی قوم میں منصبِ نبوت کی اہلیت ہوتی تو وہ بھی انسانوں کے لئے مبعوث نہیں کئے جا سکتے تھے کیونکہ وہاں بھی یہی اشکال ہوتا۔ ہاں انسانوں میں سے رسولوں کا جنات کی طرف مبعوث ہونا اس لئے مشکل نہیں کہ جنوں کے حق میں انسان کی رویت نہ تو ناقابل تحمل ہے اور نہ انسان کا صوری خوف ورعب استفادہ سے مانع ہو سکتا ہے۔ اور ادھر پیغمبر کو حق تعالیٰ وہ قوتِ قلبی عطا فرما دیتا ہے کہ ان پر جن جیسی ہیبت ناک مخلوق کا کوئی رعب نہیں پڑتا۔ اس لئے یہ اعتراض بھی لغو ہے۔ (تفسیرِ عثمانی)

جنات کا انسانوں کو ستانا اور ان کے اجسام میں داخل ہونا

(۷) ایک مسئلہ اس موضوع سے متعلق یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ آیا جنات کسی کو ستا سکتے ہیں یا نہیں اور کسی کے بدن میں داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ تو نصوص اس بارے میں کہتے ہیں یہ بھی ممکن ہے، بلکہ واقع ہے۔

آپ ﷺ کا جن کو اتارنا:

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے جنوں کو بھی اتارا ہے، چنانچہ امِّ ابان رحمۃ اللہ علیہا اپنے والد سے روایت نقل کرتی ہیں کہ ان کے دادا آپ ﷺ

کے پاس اپنے بھتیجے کو لائے، (یہ اثر جنون کا تھا یا شیطان کا، روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ہی کا تھا) اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں اس کو دعا کے لئے لایا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے مجھ سے قریب کر دو، اور اس کی پشت میری جانب کر دو، پھر آپ ﷺ نے اس کے کپڑے کو پکڑ کر مارنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ کے بغلوں کی سفیدی دکھائی دینے لگی، آپ مارتے جاتے تھے اور اور فرماتے جاتے تھے کہ ''اُخْرُجْ یَا عَدُوَّ اللّٰهِ'' اے اللہ کے دشمن نکل جا! چنانچہ تھوڑی دیر میں وہ تندرست نظر آنے لگا۔[۱]

قصۂ خرافہ:

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبیلۂ بنو عذرہ کے ایک شخص کو جنات اٹھا کر لے گئے، جس کا نام خرافہ تھا، وہ ایک عرصہ تک جنات ہی کے پاس تھا، چند دن بعد وہ خود ہی اس آدمی کو انسانوں کے پاس چھوڑ گئے، واپس آنے کے بعد لوگوں کو وہ عجیب و غریب قصے سنایا کرتا تھا، اور لوگ بعد میں ہر عجیب بات کو ''خرافہ کے قصہ'' سے تعبیر کرنے لگے۔[۲]

بچوں کی جنات کے شر سے حفاظت کا حکم:

اسی طرح ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب شام ہو جائے تو بچوں کو روک لو، کیونکہ شیاطین اس وقت منتشر ہو جاتے ہیں، (تاکہ وہ بچوں کو نقصان نہ پہنچا دیں)[۳]

---

[۱]: مسند احمد: مسند الوزاع ابن عامر۔ ۲۸۴۲۹۔ [۲]: شمائل ترمذی: باب ماجاء کلام رسول اللہ ﷺ فی السحر: ۵۲۔ [۳]: صحیح مسلم باب الامر بتغطیۃ الاناء، ۵۳۸۶۔

جنات کی نظر سے پناہ:

ایسے ہی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ جنات کے نظر لگانے سے بھی پناہ مانگتے تھے۔[۱]

ملائکہ کے ذریعہ شیاطین سے انسانوں کی حفاظت:

علّامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے:

"لَوْ لَا اَنَّ الْمَلَائِکَۃَ یَحْفَظُوْنَکُمْ لَاحْتَوَشَتْکُمُ الشَّیَاطِیْنُ کَمَا یَحْتَوِشُ الذُّبَابُ الْعَسَلَ"[۲]

اگر فرشتوں کے ذریعہ تمہاری حفاظت نہ ہوتی تو شیاطین تم کو حملہ کے لئے اس طرح گھیر لیتے جیسے کہ مکھی شہد کو۔

جنات کے بارے میں معتزلہ اور اہل حق کا رجحان:

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کے تحت لکھا ہے کہ اگرچہ بعض معتزلہ مثلاً ابو علی جبائی، ابو بکر رازی اور محمد ابن زکریا وغیرہ انکار کرتے ہیں اور بعض معتزلہ مانتے ہیں لیکن اس میں کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں یہ سب غلط ہیں، اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں کہ وہ انسان کے بدن میں داخل ہوسکتے ہیں۔ اور امام احمد ابنِ حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے نے ان سے کہا کہ بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں، توانہوں نے کہا کہ وہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔[۳]

اس موقع پر علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے دو حدیثیں نقل کی ہیں، ایک روایت تو وہی ہے جو اوپر گزرچکی ہے، اور دوسری روایت حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی ہے کہ آپ کے پاس ایک عورت بطنِ روحاء میں آئی اور کہا کہ اے اللہ کے رسول یہ میرا بیٹا

۱: سنن نسائی: باب الاستعاذۃ من عین الجان، ۵۵۱۱۔ ۲: روح المعانی: ۲/۱۳۲ دار الکتب العلمیۃ۔

۳: عمدۃ القاری: باب فضل من یصرع من الریح، ۳۱/۲۵۲۔

ہے، اس پر کچھ اثر ہے، آپ نے اس کو پکڑا اور اس کے منہ میں اپنا لعاب مبارک ڈالا اور فرمایا کہ اے اللہ کے دشمن نکل جا! میں اللہ کا رسول ہوں، یہ کہہ کر آپ نے وہ بچہ اس عورت کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ اس کو لے جاؤ، اب کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔[1]

مذکورہ مسئلہ میں علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہما کی تصریحات:

اس کے بعد عبد الجبار رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ چونکہ ان کے اجسام ھواء کی طرح (لطیف) ہوتے ہیں اس لئے ان کے انسانوں کے جسم میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[2]

نیز حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مجانین کو لایا جاتا تھا، اور آپ دستِ مبارک ان کے سینے پر رکھتے تو وہ صحت مند ہو جاتے، ایک مرتبہ ام زفر کو لایا گیا، آپ نے ان کے سینہ پر اپنا دست مارا تو وہ صحت یاب نہیں ہوئیں، آپ نے فرمایا کہ اگر میں دعا کروں تو یہ چلائے اور اگر نہ کروں تو یہ دنیا میں ساتھ رہے گا البتہ آخرت میں ثواب ملے گا، انہوں نے کہا کہ صبر کروں گی۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے متعدد طرق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان پر یہ جن کا اثر تھا۔ اور وہ کسی کو ستانے کے لئے یا کسی کی شکل پسند آنے کی وجہ سے اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔[3]

ان نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ جنات انسانوں کو ستاتے اور پریشان کرتے ہیں، جنات کی نظر بد انسانوں کو لگتی ہے، اور وہ کسی کے بدن میں داخل ہو سکتے ہیں، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بچوں کی حفاظت کا حکم فرمایا، اور نصوص میں ان کے شر سے پناہ مانگی۔

۱: عمدۃ القاری: باب فضل من یصرع من الریح، ۳۱/۲۵۲۔ ۲: عمدۃ القاری: باب فضل من یصرع من الریح، ۳۱/۲۵۲۔ ۳: فتح الباری: باب فضل من یصرع من الریح، ۱۰/۱۱۵۔

شیاطین اور جنات کا علاج قرآن سے:

عہدِ نبوی سے آج تک اس طرح کے واقعات پیش آئے ہیں اور آرہے ہیں اور علماءِ کرام اور عامل حضرات اس کا علاج کرتے آئے ہیں اور کر رہے ہیں، اور الحمد للہ اسکی حقیقت اور اس کا فائدہ سوائے ہٹ دھرموں کے کسی سے مخفی نہیں۔

اور احادیث میں نبی علیہ السلام نے قرآن کے ذریعہ علاج کا حکم دیا، آپ نے فرمایا:

"مَنْ لَمْ یَسْتَشْفِ بِالْقُرْآنِ فَلَا شَفَاهُ اللّٰهُ"

"جس نے قرآن سے علاج نہ کیا تو اللہ پاک اسے شفا نہ دیں گے"

ایک حدیث میں فرمایا: "اِسْتَشْفُوْا بِمَا حَمِدَ اللّٰهَ بِهٖ نَفْسَهٗ"[۱]

شفا حاصل کرو اس چیز سے جس سے اللہ پاک نے اپنی تعریف کی ہے۔(یعنی قرآن مجید اور سورۂ فاتحہ)

ایک اور روایت میں ہے: "عَالِجِیْهَا بِکِتَابِ اللّٰهِ" کتاب اللہ کے ذریعہ علاج کرو۔

علامہ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ علاج سے مراد وہ علاج ہے جو کتاب اللہ کی روشنی میں جائز ہو، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں کچھ لوگ ایسی چیزوں سے جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے جس میں شرک ہوتا تو آپ نے اِس رُقیہ سے منع کیا اور اُس رقیہ کی اجازت دی جو کتاب اللہ کی روشنی میں اجازت ہو اور شرک نہ ہو۔[۲]

آیۃ الکرسی اور دیگر آیات سے علاج:

ایسے ہی احادیث میں ہے کہ اگر کوئی رات میں بستر پر آیۃ الکرسی پڑھ لے تو صبح تک ایک محافظ فرشتہ اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے، اور شیطان اس کے قریب بھی نہیں پہنچ پاتا، اور شیطان نے خود اپنی زبانی یہ بات کہی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق کی تھی۔[۳]

---

[۱]: کنز العمال: کتاب الطب: الفصل الاول فی الترغیب وفیہ ذکر الادویۃ، ۲۸۱۰۲ و ۲۸۱۰۴ و ۲۸۱۰۵ و ۲۸۱۰۶۔ [۲]: صحیح ابن حبان: ۱۳/ ۴۶۴ ۶۰۹۸۔ [۳]: صحیح بخاری: باب فضل سورۃ البقرۃ و آیۃ الکرسی، ۵۰۱۰۔

اسی طرح سورۂ فلق اور سورۂ ناس میں بھی جنات اور شیاطین کے شر سے اور ان کے وساوس سے پناہ کا ذکر ہے ہے۔ اور آپ کا عمل مبارک بھی یہی تھا کہ آپ جنات سے اور ان کی نظرِ بد سے پناہ مانگتے تھے لیکن جب معوذتین کو نازل کیا گیا تو آپ وہ دونوں سورتیں پڑھتے اور ہاتھوں پر پھونکتے اور اپنے سارے جسم پر حتی الاستطاعت ان کو پھیر لیتے۔[۱]

اس طرح ان کے شر سے بچنے کے لئے اور ان سے حفاظت کے لئے اور دیگر بیماریوں کے لئے نصوص میں ان سورتوں کو پڑھنے کا ذکر ہے، اور اس کے علاوہ آپ ﷺ سے سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ کی اخیر کی آیتیں، ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (البقرہ:۱۶۴)، آیۃ الکرسی، سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر:۱۸ ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ سورۂ اعراف آیت نمبر:۵۴ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾، سورۂ مومنون آیت نمبر:۱۱۶ ﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ﴾، سورۂ جن آیت نمبر:۳ ﴿وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا﴾ سورۂ صافات کی ابتدائی دس آیات، اور سورۂ حشر کی اخیر کی تین آیات، سورۂ اخلاص اور معوذتین سے اور اس کے علاوہ دیگر ادعیہ سے اور مختلف طریقوں سے مختلف بیماریوں کا علاج ثابت ہے۔[۲] اور ان طریقوں کے علاوہ دیگر طریقوں سے بھی علاج کیا جاسکتا ہے، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں ہو، اور جائز طریقہ سے کیا جائے۔ اور اگر غیر شرعی طریقہ پر کیا جائے تو پھر ایسا علاج جائز نہیں ہے۔

تعویذات اور جھاڑ پھونک کی ممانعت کا محمل:

اور احادیث اس سلسلہ میں دونوں طرح کی ہیں، جن روایات میں آپ علیہ السلام نے جھاڑ پھونک اور تعویذات سے منع کیا ہے تو وہ ایسے ہی تعویذات تھیں جن سے کفر و

---

[۱]: سنن نسائی: باب الاستعاذۃ من عین الجان، ۵۵۱۱۔ [۲]: مستدرکِ حاکم: کتاب الرقی والتمائم، ۸۲۶۹۔

شرک کی بو آتی تھیں، اور بہت سے تعویذات اور جھاڑ پھونک کے طریقے ایسی بھی تھے جن کی آپ ﷺ نے اجازت دی، اور جو صرف خالصتاً علاج کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اور ان میں کفر وشرک اور غیر اللہ سے استمداد کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔

ایک حدیث میں ہے کہ کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس ایک رقیہ ہے، جس کے ذریعہ ہم جھاڑ پھونک کرتے ہیں لیکن آپ نے رقیہ اور جھاڑ پھونک سے منع کیا ہے، (اب ہم کیا کریں؟) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اِعْرِضُوا عَلَيَّ رُقَاكُمْ لَابَأْسَ بِالرُّقٰى مَا لَمْ تَكُنْ شِرْكًا" اپنا رقیہ بتاؤ! اس جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں ہے جس میں شرک نہ ہو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جو اپنے بھائی کو اس طرح نفع پہنچانا چاہے تو پہنچائے۔[1]

تعویذ سے علاج کے شرائط:

اس طرح کی اور بھی روایات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ علاج اگر شریعت کے حدود اور دائرہ میں ہو تو اس کی اجازت ہے، اور اگر اس میں کسی عمل سے کفر و شرک لازم آتا ہو، یا غیر اللہ سے استمداد ہو، یا غیر اللہ کو بذاتِ خود شافی اور مصیبتوں سے چھٹکارا دلانے والا سمجھا جائے، یا تعویذ کو موئثر بالذات سمجھا جائے، یا اس میں آیاتِ قرآنیہ کو ناپاک چیزوں سے لکھا جائے یا وہ ایسی ہو کہ اس کے معنیٰ معلوم ہی نہ ہوں، یا اس میں سفلیات کا سہارا لیا جائے اور سحر وغیرہ کیا جائے تو پھر ایسی تعویذات اور جھاڑ پھونک سے علاج جائز نہیں ہے۔[2]

---

[1] صحیح مسلم: باب استحباب الرقية من العين والنملة والحمة والنظرة، ۵۸۶۱۔

[2] رد المحتار: فروع يكره اعطاء السائل و فصل فی اللبس والنظر۔

کیا تعویذ باندھنا اور اس کو دھو کر پلانا غیر شرعی عمل ہے؟

(۸) اسی کے چلتے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے، جیسا کہ آج کل کچھ ناواقف لوگ کہتے ہیں کہ تعویذات کا باندھنا اور ان کا گلے میں لٹکانا غیر شرعی اور ناجائز ہے، ہاں اگر پڑھ کر دم کیا جائے تو اس کی گنجائش ہے تو ان کی یہ بات بھی جہالت اور کم علمی پر مبنی ہے، جن احادیث کو بطورِ ثبوت وہ پیش کرتے ہیں اسی سے ان کا رد ہوتا ہے، مثلاً بعض احادیث میں ہے:

"كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ عَقْدَ التَّمَائِمِ".

رسول اللہ ﷺ تعویذ باندھنے کو ناپسند کرتے تھے۔

"مَنْ تَعَلَّقَ عَلَاقَةً وُكِّلَ إِلَيْهَا"

جو تعویذ لٹکائے تو اس کو (اللہ کے بجائے) اسی کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ (یعنی وہ توکل سے بری ہے، بعض روایات میں اسے شرک کا شعبہ قرار دیا گیا ہے۔)

ایک حدیث میں ہے:

حضرت عبد اللہ اپنے گھر داخل ہوئے اور ان کی اہلیہ بیمار تھیں، "فَإِذَا فِيْ عُنُقِهَا خَيْطٌ مُعَلَّقٌ"، اور ان کی گردن میں ایک دھاگہ لٹک رہا تھا، آپ نے اسے نکال پھینکا اور فرمایا کہ "إِنَّ آلَ إِبْرَاهِيمَ أَغْنِيَاءُ عَنِ الشِّرْكِ." بے اشک آلِ ابراہیم شرک سے بری ہیں۔[۱]

ان احادیث سے بظاہر تعویذ کے باندھنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، لیکن عبارۃ النص سے تعویذ کے باندھنے کا ثبوت ملتا ہے، اور ممانعت صرف اس وجہ سے تھی کہ اس میں شرک کا شبہ تھا، اور اسی وجہ سے آپ ﷺ ابتداءً اس سے منع کرتے تھے، جیسا کہ ابھی اوپر گزرا، لیکن بعد میں صحابہ کے رقیات کو جانچا تو اس کی اجازت دیدی،

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبۃ: باب ماجاء فی تعلیق التمائم۔ ۲۳۹۲۲۔

نیز حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ ”آل ابراہیم شرک سے بری ہیں“ بتلا رہا ہے کہ ان تعویذات کا باندھنا ممنوع ہے جو غیر شرعی ہیں، اور اگر اس میں خلاف شرع کوئی عمل یا کوئی بات نہ ہو تو پھر اس کا باندھنا بھی جائز ہو گا۔

تعویذ لٹکانے میں حضراتِ صحابہ اور تابعین کا عمل:

اس سلسلہ میں ایک صریح روایت ہے، جو عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ جب کوئی نیند میں گھبرا جائے تو یہ کلمات ”اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَسُوْءِ عِقَابِهٖ، وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهٖ، وَمِنْ شَرِّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا يَحْضُرُوْنَ“ پڑھ لے، حضرت عبد اللہ اپنے بالغ بچوں کو یہ دعا سکھاتے تھے، اور جو نابالغ تھے ان کے گلے میں اس کو لکھ کر ڈال دیتے تھے۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حاملہ عورت پر ولادت مشکل ہوتی تو یہ آیتیں ”بِسْمِ اللهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللهِ رَبِّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحَاهَا، كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلَاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُوْنَ“ لکھ دی جاتیں اور ان کو دھو کر پلا دیا جاتا، ایسے ہی دیگر صحابہ اور تابعین سے قرآنی آیات لکھ کر پلانا ثابت ہے۔[2]

ان روایات سے صراحۃً صحابی کا گلے میں تعویذ ڈالنا اور لکھ کر پلانا ثابت ہوتا ہے۔

نیز کچھ اکابرِ تابعین کے اقوال اور اعمال بھی زیر تحریر ہیں، تاکہ مسئلہ اور منقح اور واضح ہو، چنانچہ حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مروی ہے کہ:

---

[1]: مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الطب: باب من رخص فی تعلیق التعاویذ۔ الاسماء والصفات: للبیہقی: ۳۹۷۔

[2]: حوالہ سابق۔

"كَانَ لَا يَرىٰ بَأْسًا بِالشَّيْئِ مِنَ الْقُرْآنِ"

"وہ قرآن لکھ کر لٹکانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے"[۱]

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لوگوں کے لئے تعویذ لکھتے تھے اور ان پر لٹکاتے تھے۔[۲]

حضرت سعید ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تعویذ اگر چمڑے میں ہو تو (اس کے لٹکانے میں) کوئی حرج نہیں ہے۔[۳]

تعویذ لٹکانے اور باندھنے کے بارے میں ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ:

ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں "وَيَجُوْزُ أَنْ يَكْتُبَ لِلْمُصَابِ وَغَيْرِهٖ مِنَ الْمَرْضٰى شَيْئًا مِنْ كِتَابِ اللهِ" اور یہ جائز ہے کہ مریضوں کی صحت یابی کے لئے قرآن میں سے کچھ لکھا جائے اور جائز مدد لی جائے، اور ان کو دھویا جائے اور پلایا جائے، جیسا کہ امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صراحت کی ہے، اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے آثار کو نقل کیا، جن میں تعویذ لکھنے، اس کو پلانے اور باندھنے کا ذکر ہے۔[۴]

نیز سعودی علماء کے بھی اس سلسلہ میں مختلف فتاویٰ شائع ہوئے، لیکن ان کا اخیر اور مفتیٰ بہ قول وہی ہے جو کہ ہمارا مسلک ہے، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔[۵]

ان نصوص اور عملِ صحابہ اور تابعین اور سلف کے فتاویٰ سے ثابت ہوتا ہے کہ بطور علاج تعویذ لکھنا، اس کا باندھنا اور لٹکانا اور اس کو دھو کر پلانا مندرجہ بالا شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

۱: مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الطب: باب من رخص فی تعلیق التعاویذ۔ ۲: حوالۂ سابق۔ ۳: حوالۂ سابق۔ ۴: مجموع الفتاویٰ: فصل فی جواز ان یکتب للمصاب وغیرہ: ۱۹/۶۴۔ ۵: فتاویٰ الشبکۃ الاسلامیہ: الشروط اللازمۃ لجواز کتابۃ الرقی وشرب مائہا، ۲/۳۶۸۰۔

مشرق اور مغرب کا رب:

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۱۸﴾

''وہی دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک (ہے)، تو تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟''

مشرق سورج کے نکلنے کی جگہ کو کہتے ہیں، اور مغرب اُس کے ڈوبنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

مشرق اور مغرب کو تثنیہ کیوں لایا گیا؟

''مَشْرِقَيْنِ'' اور ''مَغْرِبَيْنِ'' تثنیہ کا صیغہ ہے، اس کے معنیٰ ہیں کہ وہ دو مشرق اور دو مغرب کا ربّ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ پاک دو مشرقوں کے رب کیسے ہیں؟ اور اس کا کیا مطلب ہے؟ مفسرین نے اس کی کئی توجیہات کی ہیں۔

(۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ چونکہ موسمِ گرما میں سورج الگ جگہ سے طلوع ہوتا ہے اور موسمِ سرما میں الگ جگہ سے طلوع ہوتا ہے، اس لئے تثنیہ کا صیغہ استعمال فرمایا کہ وہ دو مشرقوں کا رب ہے، اسی طرح جب ان دو موسموں میں اس کا مقامِ طلوع الگ ہوگا تو مقامِ غروب بھی الگ ہوگا، اس لئے فرمایا کہ وہ دو مغربوں کا رب ہے۔[۱]

(۲) ایک مطلب یہ بھی ہے کہ چونکہ سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کی جگہ الگ الگ ہے۔ اور چاند کے نکلنے اور ڈوبنے کی جگہ الگ الگ ہے۔ اس لئے تثنیہ کا صیغہ استعمال فرمایا۔[۲]

(۳) سورج دنیا میں کہیں نہ کہیں طلوع ہوتا رہتا ہے اور کہیں نہ کہیں غروب ہوتا رہتا ہے۔ جب زمین گردش کرتی ہوئی سورج کے سامنے آتی ہے تو وہاں پر سورج کا ظہور ہوتا ہے اور زمین کا جو حصہ سورج سے چھپتا جاتا ہے وہاں سورج ڈوب رہا

۱: روح المعانی: ۲۰/۱۲۸۔ ۲: حوالۂ سابق۔

ہوتا ہے،اس اعتبار سے سورج ایک جگہ کے اعتبار سے نکل رہا ہے اورایک جگہ کے اعتبار سے ڈوب رہا ہے۔اس لئے کہا کہ وہ دو مشرقوں اور دو مغربوں کا رب ہے۔

اس مقام پر تو اللہ پاک نے تثنیہ کا صیغہ ذکر فرمایا، لیکن سورۂ معارج میں تثنیہ کے بجائے جمع کا لفظ استعمال فرمایا ہے:

﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ ﴾[۱]

اسی طرح سورۂ صافات میں بھی اللہ پاک نے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، کیونکہ ہر روز سورج کا طلوع الگ جگہ سے ہوتا ہے، اس اعتبار سے مشرق اور مغرب بہت سے ہوجائیں گے، اس لئے وہاں جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔

ایک جہالت کا ازالہ:

اللہ پاک چانداور سورج کے بھی رب ہیں، اسی نے ان کو پیدا کیا ہے، اوران کے نکلنے کے بعد جو اثرات رونما ہوتے ہیں وہ بھی اسی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ قدرتی طور پر ایک دھماکا ہوا اور دھماکے میں ایک سورج بن گیا، قدرتی طور پر ایک دھماکہ ہوا اور اُس سے چاند بن گیا، اور پھر وہ خود اپنے اسٹائل(STYLE) سے پھرنے لگے۔ جیسا کہ بعض جاہل کہتے ہیں۔ اتنا محکم اور اتنا عالی نظام، اتنے انضباط کے ساتھ چلنے والا نظام کیسے خود بخود وجود میں آسکتا ہے؟ لاکھوں اور کروڑوں ستاروں کا پیدا ہونا اور ایک نظام کے ساتھ چلنا، اُن کا پھرنا، اُن کا اپنے اپنے مدار میں ٹھہرے رہنا اور اپنے اپنے وقت پر کام کرنا، اوراس کے اثرات کا ظاہر ہونا بغیر خالق اور رب کے کیسے ہوسکتا ہے؟ اللہ پاک فرمارہے ہیں کہ میں اس کا خالق ہوں اور میں اس کا رب ہوں۔

۱: المعارج: ۴۰۔

دو دریاؤں کا بغیر اتصال کے جاری ہونا:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴿۲۰﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۲۱﴾

"اسی نے دو سمندروں کو اس طرح چلا دیا کہ وہ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک آڑ ہوتی ہے کہ وہ دونوں اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتے، اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"؟

دو سمندروں میں سے ایک میٹھے پانی کا اور ایک کھارے پانی کا سمندر ہے۔[۱]

ابن عباس رضی اللہ عنہما ان دو سمندروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان سے آسمان اور زمین کے سمندر مراد ہیں۔ جیسے زمین کا سمندر ہے ایسے ہی آسمان کا بھی سمندر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آسمان اتنا بلند ہے کہ اب تک وہاں پر کوئی پہنچا نہیں، چاند پر تو لوگ پہونچ گئے، لیکن آسمان تک نہیں پہونچے، آسمان چاند سے بہت آگے ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دنیا کے سمندروں میں سے دو سمندر یعنی بحر فارس اور بحر روم مراد ہیں۔[۲]

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بحر ہند اور بحر روم مراد ہے۔ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آسمان اور زمین کے سمندر مراد ہیں۔[۳]

کھارا پانی اور میٹھا پانی دونوں نعمت ہیں:

کھارے اور میٹھے پانی کے دونوں سمندر نعمت ہی نعمت ہیں، دونوں میں ہمارے لیے فائدے ہیں۔ اگر سارا پانی میٹھا ہی ہوتا تو اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہوجاتا،

۱: تفسیرِ رازی: ۱۵/۱۷۔ ۲: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/۱۴۱۔ ۳: تفسیر مظہری: ۱/۶۲۸۸۔

کیونکہ جب میٹھا پانی ایک جگہ جمع ہوتا ہے تو جلد خراب ہوجاتا ہے۔ اگر سارا پانی کھارا ہی ہوتا تو لوگوں کے لیے مصیبت ہوجاتی۔ اس لئے یہ دونوں پانی نعمت ہیں، پھر حق تعالیٰ شانہ کا یہ نظام ہے کہ کھارا پانی میٹھے پانی میں اور میٹھا پانی کھارے پانی میں ڈالتے ہیں۔ کھارے پانی کو اوپر لے جاتے ہیں اور اُس کو میٹھا کرکے نیچے لاتے ہیں، لیکن دونوں آپس میں ملتے نہیں، ان دونوں کے درمیان ایک پردہ اور حجاب ہے جس کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہوتے۔

پانی میں نظامِ مدو جزر سے ایک غلط فہمی:

عام طور پر میٹھے پانی کے دریا بہنے والے ہوتے ہیں اور کھارے پانی کے ٹھہرنے والے ہوتے ہیں، لیکن اس میں تموج زیادہ ہوتا ہے، مدوجزر یعنی اُتار چڑھاؤ بہت ہوتا ہے۔ چنانچہ رات میں اُتر جاتا ہے اور دن میں چڑھ جاتا ہے۔ لوگ اس کو نئے نئے نام دیتے رہتے ہیں۔

ہمارے ہاں بمبئی میں ایک بزرگ حاجی علی صاحب کا مزار ہے۔ لوگوں نے ان کے بارے میں مشہور کر رکھا ہے کہ روزانہ سمندر آکر اُن کا طواف کرکے جاتا ہے، ایک بدیہی چیز کو یہ معنی دینا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بالمقابل اگر ایک ایسی جگہ ہو جہاں کسی بزرگ کا مزار نہیں بلکہ مندر ہو اور وہاں بھی پانی کا یہی نظام ہو تو کیا آپ وہاں پر بھی یہی کہیں گے؟ نعوذ باللہ، بات دراصل یہ ہے کہ یہ مد و جزر کا ایک نظام ہے۔ لوگوں نے اس کو کچھ کا کچھ سمجھ لیا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک بزرگ کی کسی دہریے سے بات چیت ہونے لگی۔ بزرگ جو بھی بات کرتے تو دہریہ اس میں کوئی نہ کوئی اشکال ضرور کرتا، انہوں نے دو رکعت نماز پڑھی اور دُعا کی کہ اے پروردگار! مجھے ایسی کوئی دلیل سمجھا دیجیے کہ یہ مبہوت ہو جائے اور جواب نہ دے سکے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت:﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ﴾ اُن کے دل میں ڈال دی اور انہوں نے یہ آیت بیان کی کہ دیکھ! یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی قدرت ہے کہ پانی تو پانی ہے، لیکن اسی پانی کی یہ خصوصیت ہے کہ جب کھارا پانی میٹھے پانی پر جا رہا ہے تو اپنا راستہ الگ بنا رہا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ بہنے کے باوجود دونوں آپس میں مل نہیں پاتے، جب بزرگ نے یہ بات اس کے سامنے رکھی تو وہ مبہوت ہو گیا۔

ایسے ہی سنا ہے کہ پرتگال کے قریب ایک ایسا سمندر ہے جس کے ایک طرف تو بالکل سفید پانی ہے اور دوسری طرف بالکل سیاہ پانی ہے، جو سیاہ پانی ہے وہ کھارا ہے اور جو سفید پانی ہے وہ میٹھا ہے اور دونوں مل کر جاتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ بہہ رہا ہے اور وہ اپنی جگہ بہہ رہا ہے۔ کیسی اللہ پاک کی قدرت اور شان ہے؟

موتی اور مونگے بھی نعمت ہیں:

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۲۳﴾

”وہ دونوں سمندروں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے، اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

"اَللُّؤْلُؤ" کے معنٰی بڑے موتی اور "اَلْمَرْجَانُ" کے معنٰی چھوٹے موتی کے ہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ "لؤلؤ" موتی کو کہا جاتا ہے، اور بعض اس کے برعکس کہتے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ مرجان سرخ پتھر کا ہوتا ہے، جس میں درخت کی مشابہت ہوتی ہے، جو جواہرات کی ایک قسم ہے۔[1]

ایک اشکال اور اس کے جوابات:

یہاں ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ موتی کھارے پانی کے سمندر سے نکلتے ہیں، میٹھے پانی سے نہیں، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں سے نکلتے ہیں۔ مفسرین نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں۔

(۱) علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب دونوں سمندر ملتے ہیں تو گویا وہ دونوں ایک ہی ہو گئے، اس لئے ان دونوں کی طرف نسبت صحیح ہے۔[2]

(۲) ایک سمندر سے موتی نکلتے ہیں اور ایک سے مرجان، اس لئے دونوں کی جانب نسبت کی گئی ہے۔[3]

(۲) بعض علماء نے کہا کہ سیپی کھارے پانی ہی میں بنتی ہے لیکن جب وہ اپنا منہ کھول کر باہر آتی ہے تو بارش کا پانی اس میں چلا جاتا ہے، اور وہ میٹھا ہوتا ہے، گویا اس کا وجود کھارے اور میٹھے دونوں پانی سے ہوتا ہے اس لئے فرمایا کہ وہ دونوں سے نکلتے ہیں۔[4]

(۳) امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اچھا جواب دیا۔ فرمایا کہ موتی اس جگہ پیدا ہوتا ہے جہاں دونوں ملتے ہیں، پھر سیپی کھارے پانی کی تلاش میں میٹھے پانی سے نکل کر چلی جاتی ہے، تاکہ موتی جم سکے، جیسے کہ عورت ابتداءِ حمل میں کسی کھاری، کھٹی اور چٹپٹی

---

[1]: تفسیر مظہری: ۱/۶۲۸۸۔ [2]: روح المعانی: ۲۰/۱۳۳۳۔ [3]: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/۱۴۲۔

[4]: تفسیرِ مظہری: ۱/۶۲۸۸۔

چیز کی خواہش رکھتی ہے۔ پھر کھارے پانی میں رہ کر اس میں ثقل اور بوجھ پیدا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ دوبارہ واپس نہیں آسکتی، اور غواص اس کو کھارے پانی سے نکال لیتے ہیں۔ اس لئے دونوں کی جانب نسبت کی گئی ہے۔[۱]

(۴) بعض کہتے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے، اور اصل عبارت ہے: "مِنْ اَحَدِھِمَا"، مطلب یہ ہے کہ ان دو سمندروں میں سے ایک سے موتی اور دوسرے سے مونگے نکلتے ہیں۔[۲]

(٦) بعض کہتے ہیں کہ اہل عرب کلام میں دو جنس ذکر کرتے ہیں، لیکن خبر ایک سے متعلق دیتے ہیں، جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ﴾

اے جنات اور انسان کے گروہ! کیا تم میں سے تمہارے پاس رسول نہیں آئے"

یہاں "مِنْکُمْ" میں بظاہر جنات بھی مخاطب ہیں، کہ کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے؟ حالانکہ رسول تو انسانوں ہی میں سے آتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی اللہ پاک نے "مِنْھُمَا" کہا جس میں بظاہر دونوں سمندر شامل ہیں، لیکن مراد یک ہی سمندر ہے۔[۳]

(۷) بعض نے کہا کہ ہمیں یہ تسلیم ہی نہیں ہے کہ میٹھے پانی میں موتی نہیں ہوتے، کیونکہ موتی تو میٹھے پانی میں بھی ہوتے ہیں، لیکن لوگ نکال نہیں پاتے، کیونکہ میٹھے پانی میں بہاؤ زیادہ ہوتا ہے، اس لئے لوگ کھارے پانی سے اس کو نکالتے ہیں۔[۴]

موتی اور مونگے کے فوائد:

موتی اور مونگے بھی اللہ پاک کی نعمتیں ہیں، اور بڑے فائدے کی چیزیں ہیں، اور کئی چیزوں میں استعمال ہوتے ہیں، حتیٰ کہ دواؤں میں بھی ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ موتی اور مونگے دل، جگر، دماغ، اعضائے رئیسہ کی قوت کے واسطے بے انتہا مفید ہیں۔

---

[۱]: تفسیرِ رازی: ۱۵/ ۷۳۔ [۲]: حوالۂ سابق۔ [۳]: تفسیرِ مظہری: ۱/ ۶۲۸۸۔ [۴]: تفسیرِ رازی: ۱۵/ ۷۳۔

ایک مرتبہ میں ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری کے زمانے میں حیدرآباد کے ایک پرانے حکیم صاحب کے پاس گیا اور خمیرِ مروارید بنانے کے لیے کہا۔ خمیر مروارید موتیوں کے خمیرے کو کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج کل اصلی موتی ملتے نہیں ہیں اور اگر میں اصلی موتی لا کر بناؤں گا تو اس کے پیسے زیادہ ہوں گے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ اصلی موتی لا کر بنائیے۔ حکیم صاحب موتی اور مونگے لائے اور اڑتالیس گھنٹے تک اُس کو پیسا۔ اور کہا کہ اس کو بالکل غبار بنانا ہوتا ہے تب کہیں جاکر یہ خون میں شامل ہو سکتا ہے اور اس سے فائدہ ہوتا ہے، اور اگر اس میں ذرا برابر بھی کثافت رہی تو پھر یہ جسم سے نکل جاتے ہیں اور ہضم نہیں ہوتے، اور فائدہ کے بجائے الٹا نقصان بھی ہو سکتا ہے، پھر اس کو سیب کے رس یا شہد میں ملاکر کھایا جاتا ہے، اس کے بعد انہوں نے اس کی تاثیر بتاتے ہوئے کہا کہ یہ اتنا موثر ہوتا ہے کہ اگر ایک خوراک میں اس کا فائدہ ظاہر نہ ہوا تو میں پیسے نہیں لوں گا۔ غرض میں نے صرف اس کے نعمت ہونے کو بتانے کے لئے اس بات کا ذکر کیا کہ اس طرح بھی ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زیب و زینت کے لئے بھی یہ استعمال کئے جاتے ہیں۔

نعمتوں کی ترتیب پر ایک نظر:

اللہ پاک نے ان نعمتوں کو بیان کرنے میں ایک ترتیب قائم فرمائی ہے، آپ غور کریں تو پتہ چلے گا کہ اولاً اُن نعمتوں کو بیان فرمایا جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اس کے بعد اُن نعمتوں کو بیان کیا گیا جو آدمی کے لیے ضروری ہیں، جن کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اب ان نعمتوں کو بیان کر رہے ہیں، جن کا آدمی محتاج اور ضرورتمند تو ہوتا ہے لیکن زیب و زینت کے لئے۔

اسلام اور زیب وزینت

یہ اور اعتبارات سے بھی نعمت ہیں لیکن زیب وزینت کے اعتبار سے بھی نعمت ہیں۔ اسلام زینت کو منع نہیں کرتا۔ اسلام میں اس کی بھی اہمیت ہے، ہاں وہ زینت جس میں حدود شرع کا لحاظ نہ ہو تو پھر اس کی اجازت نہیں ہے۔

سمندری جہاز پر ملکیت اللہ ہی کی ہے:

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿٢٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٢٥﴾

”اور اسی کے قبضہ میں وہ جہاز ہیں جو سمندروں میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے کئے گئے ہیں، اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

ایک نکتہ:

جاریۃ کی جمع ہے جوار، اس کے معنیٰ کشتی کے آتے ہیں، یا پھر یہ کشتی کی صفت ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ پاک نے جب حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا تو کہا ﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا﴾ (ہود:۳۷) اور کشتی کے لئے ”فُلکْ“ کا لفظ استعمال فرمایا، وہاں کشتی کے لئے جاریہ کا لفظ استعمال نہیں کیا، کیونکہ جاریہ کے معنی چلنے اور جاری ہونے کے ہیں، اور کشتی اس وقت تک چلی نہیں تھی، اب جب وہ بن گئی اور چلنے لگی تو لفظ جاریۃ استعمال فرمایا۔[۱]

سمندر میں کشتیوں کا قائم رہنا بھی اللہ پاک کی بڑی نعمت ہے، پانی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ڈبو دے، لیکن اللہ پاک نے کشتی بنانے اور چلانے کا علم و فہم انسان کو عطا فرمایا، جس کی وجہ سے وہ کشتیاں بناتا ہے، اور اس کی بقا کے لئے اور نہ ڈوبنے کے

---

[۱]: تفسیرِ رازی: ۱۵/ ۷۵۔

لئے ایسے طریقے اور ایسی ترکیبیں کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ڈوبنے سے محفوظ رہتی ہیں، یہ طریقے اور ترکیبیں بھی اللہ پاک ہی سجھاتے ہیں۔

کشتیوں نے گویا ملکوں کو سمیٹ دیا:

اور پھر ان کشتیوں کے ذریعہ پوری دنیا گویا ایک شہر ہوگئی، پوری دنیا کا اقتصادی نظام گویا سمٹ گیا، ایک ملک سے دوسرے ملک سامانوں کا لانا اور لے جانا انتہائی آسان ہوگیا، اگر یہ سمندر نہ ہوتے تو کتنی مشقت اور تکلیف ہوتی؟ اب انہیں کشتیوں کے ذریعہ دنیا بھر کے پھل آرہے ہیں، غلے آرہے ہیں، دیگر ضروریاتِ زندگی کی چیزیں ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کی جارہی ہیں، یہ اللہ پاک کی کتنی بڑی نعمت ہے ؟ انسان اس کے بارے میں کبھی سوچتا ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری سہولت کے لئے کتنا بڑا انظام آسان کر دیا ہے۔

کشتیوں کی پہاڑوں سے تشبیہ:

اللہ پاک نے کشتیوں کو ”اعلام“ یعنی پہاڑوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جیسے بڑے بڑے پہاڑ زمین پر ٹھہرے ہوئے ہیں ایسے ہی بڑی بڑی کشتیاں سمندروں میں سامان اور مسافروں کو لے کر چلتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کشتی کا ایک حصہ اوپر ہوتا ہے اور دوسرا حصہ جو کہ انتہائی وزن ہوتا ہے، وہ پانی کے نیچے ہوتا ہے۔ اور ہو بہو یہی بات پہاڑوں میں بھی ہوتی ہے۔ پہاڑ کا جتنا حصہ اوپر ہوتا ہے اُس سے دوگنا وزن دار حصہ اس کے نیچے ہوتا ہے، اسی طرح یہ کشتیاں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ اوپر سے زیادہ وزنی نیچے کا حصہ ہوتا ہے، جو پانی میں ہوتا ہے تاکہ سمندر کی موجوں اور لہروں سے وہ الٹ نہ جائے۔ اور ثابت قدم رہے۔

قرآن کا اعجاز:

یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں قرآن پاک اُترا اس زمانے میں پہاڑوں کی طرح کشتیاں بنانے کا کوئی رواج نہیں تھا، اس وقت بھی کشتیاں تھیں لیکن اتنی بڑی نہیں تھیں۔ آج جو کشتیاں بن رہی ہیں وہ بالکل ایک شہر کی طرح ہوتی ہیں، ایک جہاز کے اندر سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جہاز اور ہزاروں آدمی ہوتے ہیں۔

جب ہم "سان ڈیئے گو" (San Diego) گئے تھے تو وہاں پر ایک ریٹائر فوجی لاکھانی صاحب ہمیں تفریح کیلئے ایسی جگہ لے گئے، جہاں ایک فوجی جہاز کھڑا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس میں پانچ ہزار فوجی ہیں اور اس میں ایٹمی توانائی ہے، یہاں بیٹھے بیٹھے اس کے ذریعے آدھی دنیا کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے گویا اس آیت میں یہ اشارہ کیا کہ ان سمندروں میں پہاڑوں کی طرح بڑی بڑی کشتیاں بھی چلیں گی، اور وہ تمہارا رب ہی چلائے گا۔ اور آج دنیا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

حضور کی بحری جہاز سے ایک تمثیل:

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ دو منزلہ جہاز کی مثال دی اور فرمایا کہ جہاز میں چند لوگ اوپر کی منزل میں ہیں اور کچھ لوگ نیچے کی منزل میں، اب نیچے والے اوپر والوں سے پانی لینے کے لیے جاتے ہیں، اور بار بار اوپر جانے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے تو ان لوگوں نے سوچا کہ بار بار اوپر کی منزل میں جانے سے ہمیں بھی تکلیف ہورہی ہے اور انہیں بھی حرج ہو رہا ہے، ایسا کیوں نہ کرلیں کہ نیچے سوراخ کرلیں، اور یہیں سے پانی حاصل کرلیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر اوپر والے نیچے والوں کو سوراخ کرنے سے نہیں روکیں گے تو نیچے والے بھی ڈوب

جائیں گے اوراوپر والے بھی ڈوب جائیں گے۔[۱] یہ حضور ﷺ کے معجزات میں سے ہے کہ آپ نے کبھی سمندری سفر نہیں کیا،اس وقت جہاز دو منزلہ ہوتا بھی نہیں تھا،اور آپ ﷺ نے دو منزلہ جہاز کی مثال بیان فرمائی۔

اللہ پاک نے حضور پاک ﷺ کی زبان مبارک سے بطورِ معجزہ بتادیا کہ بعد میں جو انسان سمندری جہاز بنانے والے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوگی،پہاڑوں کی طرح بڑے بڑے جہاز ہوں گے۔ظاہری طور پر بندے بناتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی تدابیر سجھانا اور اسباب بنانا اللہ پاک ہی کا کام ہے،اور ان سب کے حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔اور ان کو چلانے والے بھی اللہ پاک ہی ہیں،آپ دیکھیں کہ کتنے بڑے بڑے جہاز ہیں،سمندری موجیں جب اٹھتی ہیں اور کسی بھنور کا سامنا ہوتا ہے تو بچنے کے سارے اسباب اختیار کئے جاتے ہیں،لیکن پھر بھی سمندری موجوں میں وہ ڈوب جاتے ہیں۔پتہ چلا کہ ان کو چلانے والا کوئی اور ہے،اللہ پاک فرمارہے ہیں کہ وہ میں ہوں،میں ہی اس کو چلاتا ہوں،تم نہیں۔جب میں ڈبونا چاہوں تو ڈبو دوں،تمہاری کوئی تدبیر کسی کام کی نہیں ہوتی۔

ہر شئ کو فنا ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٢٨﴾

زمین میں جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے۔اور صرف تمہارے پروردگار کی جلال والی فضل وکرم والی ذات باقی رہے گی۔اب بتاؤ کہ تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"؟

---

[۱] صحیح بخاری:کتاب الشرکۃ:باب ھل یقرع فی القسمۃ،۲۴۹۳۔

وجہ سے کیا مراد ہے؟

"وَجۡهُ" چہرے کو کہتے ہیں، یہاں پر باری تعالیٰ کی ذات مراد ہے، کیونکہ عام طور پر کسی کے چہرے ہی کے ذریعے اُس کی ذات پہچانی جاتی ہے، اس لئے وجہ کا ذکر کیا، لیکن باری تعالیٰ کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ "وَجۡهُ" سمت یا جانب کو کہتے ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے پروردگار کی سمت جو چیز ہے وہ باقی رہنے والی ہے۔ یعنی جو اعمال تم اللہ کیلئے کروگے اور جو چیز اللہ تعالیٰ سے متعلق ہوگی وہ باقی رہے گی، کبھی ختم نہیں ہوگی۔

اس مفہوم کے اعتبار سے گویا اس میں اخلاص کی تعلیم ہے۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے معنٰی ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔[1]

فنائیت میں زمین کی تخصیص کیوں؟

بظاہر آیت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ زمین پر رہنے والی مخلوق فنا ہونے والی ہے، لیکن فنا تو ہر چیز کو ہے، چاہے وہ زمین کی ہو یا آسمان کی۔ چونکہ آدمی زمین ہی کی چیزوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے اس لیے یہاں زمین کا تذکرہ ہے، ورنہ انسان، جنات، سورج، چاند، ستارے، آسمان، زمین اور زمین و آسمان میں رہنے والی تمام مخلوقات فنا ہونے والی ہیں۔[2]

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اس آیت میں اللہ پاک نے "مَنۡ" کا لفظ استعمال کیا ہے، جو عاقلوں یعنی انسانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں مطلب یہ نکلتا ہے کہ زمین پر جو عاقل ہیں وہ فنا ہونے والے ہیں، حالانکہ فنا تو عاقل اور غیر عاقل سب کو ہے۔

---

[1]: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/ ۱۴۴۔ [2]: تفسیرِ رازی: ۱۵/ ۷۷۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہاں آیت سے دنیا کی بے ثباتی اور آخرت سے ڈرانا مقصود ہے اور یہ فائدہ عاقل ہی حاصل کر سکتا ہے، اس لئے ''مَنْ'' کا لفظ استعمال فرمایا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ انسان سب مخلوقات میں سب سے افضل اور اشرف ہے، اس لئے اس کو تمام مخلوق میں فوقیت دیتے ہوئے اور غالب رکھتے ہوئے ''مَنْ'' کا لفظ استعمال فرمایا، جس سے بظاہر انسان کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔[1]

سزاؤں کا ذکر بھی نعمت ہے:

یہاں سے اللہ پاک آخرت کی یاد اور اخروی سزاؤں اور مصیبتوں کا ذکر فرما رہے ہیں، صورت کے اعتبار سے یہ سزائیں ہیں، لیکن بیان کے اعتبار سے یہ بھی نعمتیں ہیں اس لئے کہ ہر حکومت میں چوروں ڈاکوئں کو پکڑنا اور غلط کاروں کا مؤاخذہ، ظالموں کو ظلم کی سزا وغیرہ یہ سب حکومت میں اچھے کام اور فرائض میں شمار ہوتے ہیں اور یہ چیزیں سارے انسانوں کیلئے نعمت ہوتی ہیں، اور پھر اگر اللہ تعالیٰ آخرت کے نظام، وہاں کی سزائیں اور مصیبتوں کا ذکر نہ کریں اور آدمی کو اس کے اعمال بد کی وجہ سے سزا دے دیں تو وہ کہے گا کہ سزا سے پہلے اگر ہمیں کچھ بتا دیا جاتا تو ہم کچھ تیاری کر لیتے، اور کچھ بچنے کا انتظام کر لیتے۔ اس لئے اللہ پاک پہلے ہی سے بتا رہے ہیں کہ وہاں حساب و کتاب ہو گا، اعمالِ بد کی وجہ سے مؤاخذہ ہو گا اور سزا دی جائے گی تاکہ بندہ اپنی اصلاح کر لے اور صحیح طریقہ پر زندگی گزار لے۔

سزاؤں کے ذکر پر بھی شکر گزار ہونا چاہئے:

دنیا میں ایک آدمی نے دوسرے کو قتل کیا، اس کو زخمی کیا، اُس کے پیسے دبا لئے، لیکن وہ اس کے جواب میں خاموش رہا، اُس نے کچھ بُرا نہیں کہا، کوئی گالی نہیں دی، اُس کا قصور یہ ہے کہ وہ شریف ہے، کمزور ہے، اس وجہ سے اُس کے ساتھ یہ

---

[1] تفسیر رازی: ۱۵/ ۷۷۔

سلوک کیا گیا، اور پھر جاتے جاتے اُس کو زخمی بھی کر دیا گیا تاکہ پولیس میں رپورٹ نہ کر سکے۔ اگر آخرت کا کوئی نظام قائم نہ ہوتا اور وہاں پر مجرم کو پکڑا نہیں جاتا اور جو مظلوم ہو اُس کو بدلہ نہیں دلوایا جاتا اور جس نے صبر کیا اُس کو ثواب نہیں دیا جاتا اور جو اللہ کے حکم پر قائم رہا اُس کو کچھ نہیں دیا جاتا تو پھر یہ بڑی مصیبت اور ظلم کی بات ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت میں مجرموں کو دی جانے والی سزاؤں کا بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ مجرموں کو یہ سب سن کر دنیا میں ہدایت ہوگی، وہ توبہ کریں گے، اور ان کاموں سے رک جائیں گے، مظلوم ظلم سے بچیں گے، اور آخرت میں ان کو ظلم کی دادرسی کا موقع ملے گا۔ انصاف کیا جائے گا، جن لوگوں کی حق تلفی ہوئی ہے اُن کو ان کا حق دیا جائے گا۔ جن لوگوں نے صبر اور برداشت کیا ہے ان کو ان کے صبر کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور اللہ کے نیک، محبوب اور فرمانبردار بندوں نے جو مجاہدے اور قربانیاں دی ہیں اُن کو اس کا اجر دیا جائے گا۔ ان مضامین کو سن کر انہیں تسلی ہوگی۔ اُن کے ایمان میں تازگی ہوگی۔ اور ان کو نیک اعمال پر جمے رہنے کا جذبہ پیدا ہوگا اور آخرت میں ثواب کی امید ہوگی۔ اس لئے ان مضامین کو سن کر بھی حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

مصیبت کا ذکر نعمت ہونے کی ایک مثال سے وضاحت:

جیسے اگر کسی کا ایکسیڈنٹ (Accident) ہو جائے اور راستہ بلاک (block) ہو جائے، اور آپ ایک ایسی اسٹریٹ پر جا رہے ہیں جہاں سے پلٹنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اُدھر سے آتے ہوئے آدمی نے آپ کو بتایا کہ وہاں پر ایکسیڈنٹ ہو گیا اور آگے راستہ بلاک (Block) ہے۔ آپ آگے مت جایئے، تو آپ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے پہلے ہی بتا دیا، ورنہ اگر مجھے وہاں جا کر پتہ چلتا کہ راستہ بلاک (Block) ہے تو میں وہاں پھنس جاتا، بڑی مصیبت ہو جاتی، آدمی شکریہ اس لیے ادا کرتا ہے کہ اس نے اگلی مصیبت کو پہلے ہی سے بتا دیا۔ یہ تو عارضی مصیبت ہے جس پر آدمی شکریہ

ادا کرتا ہے۔ لیکن آخرت کی مصیبتیں تو اصلی ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کی ہیں، اور یہاں کے مقابلہ میں کئی گنا سخت ہیں، اس لئے اس کے بتانے کا بھی ہمیں ضرور شکر ادا کرنا چاہئے۔

فرماتے ہیں کہ یہ دنیا ختم ہونے والی ہے اور اس کے ختم ہونے کے بعد دوسرا نظام قائم ہونے والا ہے۔ اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی جو عظمت والی ہے اور احسان والی ہے۔

فرشتوں کی ایک خوش فہمی کا ازالہ:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب اللہ پاک نے یہ آیت "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ" نازل کی تو فرشتوں نے کہا کہ زمین والے تو ہلاک اور برباد ہو گئے، اللہ پاک نے جواب میں یہ آیت نازل کی: ﴿كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾[۱]

ہر شئی ہلاک ہونے والی ہے، سوائے اس کی ذات کے۔

زمین و آسمان اور تمام عالم اور ان میں پائی جانے والی ساری مخلوقات فنا ہونے والی ہیں، کسی کو بقا نہیں ہے۔[۲]

ذاتِ الٰہ بڑی باعظمت اور بااحسان ہے:

"ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ"

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس رب کی ذات باقی رہنے والی ہے وہ عظمت والی، اکرام اور احسان والی ہے۔

اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ ہے کہ اللہ کی ذات ہی تنہا ہر طرح کی عظمت، اکرام اور اعزاز کی مستحق ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے اعتبار سے جو بادشاہ اور عظمت والے ہوتے ہیں وہ رعایا پر عام طور پر توجہ نہیں دیتے، ان کے ساتھ شفقت سے پیش نہیں آتے، وہ

۱: القصص:۸۸۔ ۲: تفسیر قرطبی:۱۷/۱۴۳۔

اپنی شان، فخر، غرور اور تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ بے انتہا عظمت والے اور اس کے ساتھ بے انتہا احسان والے بھی ہیں۔ اپنے بندوں پر شفقت کرتے ہیں، ان کی ضروریات پوری کرتے ہیں، ان کی دعاؤں کو قبول فرماتے ہیں۔ اُن کو سمجھاتے ہیں، اُن کو اچھے اور بُرے کی تمیز بتاتے ہیں۔

اکرام اور انعام میں فرق:

ایک ہے انعام اور ایک ہے اکرام، اب تک انعامات کا ذکر چل رہا تھا، لیکن یہاں اللہ پاک نے صفتِ اکرام کا ذکر کیا، علماء نے ان دونوں میں فرق بیان کیا ہے، انعام تو خاص اور عام نیک اور بد، گنہگار اور پاک، مکرم اور غیر مکرم سب پر ہوتا ہے، اور اکرام صرف انہیں لوگوں کا ہوتا ہے، جن سے محبت ہو، جو نیک ہوں، مکرم ہوں، گناہوں سے بچتے ہوں۔[1]

صفاتِ جلال واکرام کی فضیلت:

اللہ پاک کی ان دو صفات کی بڑی اہمیت ہے، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اَلِظُّوْا بِیَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ“[2]

”یاذاالجلال والاکرام“ کے ذریعہ اللہ پاک کے سامنے گریہ وزاری کرتے رہو، یا اس کو لازم پکڑ لو۔

احادیث میں ہے کہ اللہ پاک اس اسم کے ذریعہ دعا مانگنے پر دعا قبول فرماتے ہیں۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی انہی اسماء کے ساتھ اللہ پاک سے خوب گریہ وزاری کر رہا تھا، اچانک اس کو ایک آواز آئی کہ میں نے تمہاری ندا سن لی، بتاؤ تمہاری حاجت کیا ہے؟[3] اتنی عظمت اور اہمیت والے یہ اسماء ہیں، اس لئے ان کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

---

[1]: فیض القدیر: حرف الہمزۃ: ۲/ ۱۶۰۔ [2]: سنن ترمذی: کتاب الدعوات: باب یاحی یاقیوم، ۳۸۶۷۔
[3]: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/ ۱۶۶۔

مخلوقات اللہ کی بھکاری ہیں:

یَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿٢٩﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٠﴾

اسی سے (اپنی اپنی حاجتیں) سب آسمان اور زمین والے مانگتے ہیں وہ ہر وقت ایک نئی شان میں رہتا ہے۔ سوائے جن وانس! تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

علّامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ آسمان والے تو رحمت مانگتے ہیں اور زمین والے رحمت اور رزق دونوں مانگتے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آسمان والے تو مغفرت مانگتے ہیں اور زمین والے رزق اور مغفرت مانگتے ہیں۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آسمان والے بھی زمین والوں کے لئے رزق طلب کرتے رہتے ہیں۔[۱]

فرشتے بھی اللہ کے محتاج ہیں:

ساری مخلوق اللہ پاک کی بھکاری اور محتاج ہے، سب اُسی سے سوال کرتے ہیں۔ چاہے وہ آسمان والے ہوں یا زمین والے۔ حالانکہ آسمان والوں کو نہ کھانے کی ضرورت ہے اور نہ پینے کی، سردی اور گرمی، بیوی اور بچوں سے وہ مستغنی ہیں، لیکن وہ بھی اللہ پاک کے محتاج ہیں، اگر اللہ تعالیٰ اُن سے کسی بات پر ناراض ہو جائیں تو پھر ان کی ہلاکت وبربادی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے، اس لئے وہ بھی اللہ پاک کے محتاج ہیں۔

ان کی عظمت و کبریائی اور اُن کی قدوسیت کے سامنے کچھ فرشتے سرنگوں ہے تو کچھ تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں، اور کچھ لاکھوں اور کروڑوں سال سے سجدے میں پڑے ہیں، ایک ایک فرشتہ اتنا بڑا ہے کہ زمین وآسمان اُن کے سامنے چھوٹے سے تنکے کی طرح ہیں، اُن کے مونڈھوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمین ان کے مونڈھوں کے درمیان تِل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱: تفسیرِ قرطبی: ۱۶۶/۱۷۔

حاملانِ عرش جو چار فرشتے ہیں اُن کا حال یہ ہے کہ ان کے کان سے مونڈھے تک کی مسافت سات سو سال کی ہے۔[1] اتنی بڑی اتنی طاقتور مخلوق ہونے کے باوجود وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے لرزاں وترساں ہیں۔ اور اللہ پاک سے دعا کرتے رہتے ہیں، مانگتے رہتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں۔

انسان تو ضرورتوں کا مجموعہ ہے:

جب فرشتوں کی یہ حالت ہے تو پھر اُن کے سامنے زمین والوں کی کیا حیثیت ہوگی؟ زمین والوں کی ضروریات تو زیادہ ہیں، یہ رزق بھی مانگتے ہیں، عافیت بھی مانگتے ہیں، تندرستی بھی مانگتے ہیں، عزت بھی مانگتے ہیں، غنیٰ بھی مانگتے ہیں، خواہشات بھی مانگتے ہیں، اولاد بھی مانگتے ہیں، ملازمتیں بھی مانگتے ہیں، پیسے بھی مانگتے ہیں، ہر چیز مانگتے ہیں۔ آدمی تو حاجتوں کا مجموعہ ہے۔

اگر انسان کے بارے میں آپ غور کریں تو آپ کو ضرورتوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ سب مانگتے ہیں۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ سب کو دیتے ہیں۔ آج تک جس کو جو کچھ بھی ملا اور جو کچھ مل رہا ہے اور جو کچھ ملے گا وہ اللہ تعالیٰ ہی سے ملا ہے اور اللہ ہی سے ملتا رہے گا، کسی اور سے نہ ملا ہے اور نہ مل سکتا ہے، اس لئے اسی سے مانگنا چاہئے۔

سوال بزبانِ قال یا حال:

یہ مانگنا اور سوال کرنا دو قسم کا ہوتا ہے ایک سوالِ قالی اور ایک سوال حالی۔ سوال قالی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے مانگے کہ اے اللہ! آپ مجھے یہ چیز دے دیجئے، اور سوالِ حالی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی زبان سے تو نہ مانگے، البتہ اس کی حالت ایسی ہو جس سے اس کی محتاجگی اور فقیری ظاہر ہوتی ہو، گویا اس کی حالت مانگتی ہے کہ مجھے اس چیز کی ضرورت ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: باب فی الجہمیۃ والمعتزلۃ، ۴۷۲۷۔

مخلوقات کی حقیقت:

ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب تصوف کے مضامین بیان کرتے تھے تو کبھی کبھی ہم لوگوں سے بھی آسمان کی طرف اشارہ کرکے پوچھتے تھے کہ یہ کیا ہے؟ ہم اس وقت چھوٹے تھے۔ ہم کہتے تھے کہ یہ آسمان ہے۔ وہ کہتے کہ یہ تو اس کا نام ہے، میں نام نہیں پوچھ رہا ہوں، سورج کے بارے میں پوچھتے کہ یہ کیا ہے؟ ہم کہتے کہ یہ سورج ہے، تو وہ کہتے کہ سورج تو اس کا نام ہے، میں اس کا نام نہیں پوچھ رہا ہوں، اسی طرح بہت سی چیزوں کی طرف اشارہ کرکے پوچھتے تو ہم اس کا نام لیتے، حضرت کہتے کہ میں اس کا نام نہیں پوچھ رہا ہوں، بلکہ اس کی حقیقت پوچھ رہا ہوں، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ سب مخلوق ہیں، پھر فرماتے کہ مخلوق کا مطلب سمجھتے ہو؟ پھر اس کو سمجھاتے کہ مخلوق اپنے وجود سے پہلے معلوم اور معدوم ہوتی ہے، یہ سب پہلے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھے، اُس کے بعد اللہ پاک نے انہیں وجود بخشا، یہ معلوماتِ الٰہیہ موجود نہیں تھے لیکن وجود کو چاہتے تھے، وجود کے محتاج اور بھکاری تھے، اس لئے اللہ پاک نے سب کو وجود عطا فرمایا۔ اور صرف وجود ہی نہیں بلکہ وجود کے ساتھ وجودی صفات کا بھی ہونا ضروری ہے، اس لئے وہ صفات بھی عطا کی گئیں، ہم اندھے تھے، ہم نے اپنی زبان سے تو مانگا نہیں لیکن اس نے آنکھیں عطا کیں، کیونکہ ہمارا مانگنا زبانِ حال سے تھا، ہم زبان حال سے کانوں کو مانگ رہے تھے۔ ہم زبانِ حال سے زبان کو مانگ رہے تھے۔ ہم زبانِ حال سے اپنا سر مانگ رہے تھے، ہم زبانِ حال سے ہاتھ مانگ رہے تھے، ہم زبانِ حال سے پیر مانگ رہے تھے، ہم زبان حال سے اپنا دل مانگ رہے تھے، کھانا پینا مانگ رہے تھے، اس کو ہضم کرنے کے لئے معدہ مانگ رہے تھے، خون بنانے کے لیے جگر مانگ رہے تھے، اس کے فضلہ کو نکالنے کے لیے گردے مانگ رہے تھے، جو کچھ بھی ہمارے پاس موجود

ہے ہم وہ سب زبانِ حال سے مانگ رہے تھے۔ اس لئے اللہ پاک نے وہ سب چیزیں ہمیں عطا فرمائیں اور فرمایا:

﴿وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾[1]

اور جو جو چیز تم نے مانگی تم کو ہر چیز دی، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر تم (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لاسکتے (مگر) یہ سچ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے۔

دعا عبادتوں کا مغز اور رحمتوں کا سبب ہے:

بندوں کا مانگنا اور اپنی محتاجگی کا اظہار کرنا اللہ پاک کو بہت پسند ہے، وہ ایسی ذات ہے جنہیں نہ مانگنے پر غصہ آتا ہے۔ وہ نہ مانگنے والے پر زندگی تنگ کر دیتے ہیں تو پھر وہ مانگنے لگتا ہے۔

اسی وجہ سے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس آدمی کے لئے دُعا کا دروازہ کھل گیا اُس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے۔[2]

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ"[3] دُعا تو عبادت کا مغز اُس کی روح اور جان ہے۔

نعمتوں کا حصول بطورِ تجدد امثال ہے:

ہمارے اندر جو وجودی صفات ہیں ان کی بڑی عجیب و غریب حالت ہے۔ حیات، علم، ارادہ، قدرت، سماعت، بصارت، اور کلام کو "وجودی صفات" کہتے ہیں۔ یہ سب خاص صفات کہلاتی ہیں، اس کے علاوہ دیگر صفات اس کی شاخیں ہیں۔ یہ وجودی صفات انسان کو ایک ساتھ عطا نہیں کی گئیں، مثلاً اللہ پاک نے آنکھ میں روشنی اور بینائی عطا فرمائی، اگر کوئی کسی کی آنکھ پھوڑ کر وہاں سے نور کا خزانہ لینا چاہے تو نہیں لے سکتا، وہاں

۱: ابراہیم: ۳۴۔ ۲: سنن الترمذی: باب من ابواب الدعوات۔ ۳: سنن ترمذی: باب فضل الدعاء، ۳۳۷۱۔

کوئی نور کا ذخیرہ رکھا ہوا نہیں ہے، آنکھوں میں ضرورت کے موقع پر ہی نور مہیا کیا جاتا ہے۔ ہر ہر سیکنڈ میں ہم آنکھوں کی بینائی مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر ہر سیکنڈ میں دیتے ہیں۔ ایک سیکنڈ میں کئی مرتبہ، کئی چیزیں اور کئی نعمتیں آدمی اپنی زبانِ حال سے مانگتا ہے۔ اور اللہ پاک عطا فرماتے ہیں۔ آنکھوں کی بینائی تسلسل سے ملتی ہے، کانوں کی شنوائی تسلسل سے ملتی ہے، زبان کی گویائی تسلسل سے ملتی ہے، زندگی تسلسل سے ملتی ہے۔ جیسے بجلی میں کرنٹ کا ایک حصہ جلتا ہے، پھر دوسرا نیا حصہ آتا ہے، وہ جلتا ہے، پھر تیسرا نیا حصہ آتا ہے، ایسے ہی آدمی کو حیات مسلسل دی جاتی ہے۔ آدمی کی ایک ایک نعمت فنا ہوتی رہتی ہے اور نئی نئی نعمتیں اسے دی جاتی رہتی ہیں۔ اور یہ سب اتنے تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے گویا ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ہی ساتھ دے دیا گیا ہے۔ جیسے اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو اوپر سے نیچے تک دھار بن جاتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے خط کھینچ دیا ہو، لیکن وہاں تو ایک کے بعد دوسرا قطرہ، دوسرے کے بعد تیسرا قطرہ، تیسرے کے بعد چوتھا قطرہ گرتا ہے، یہ سب اتنا تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے ایسا لگتا ہے کہ بادلوں سے لے کر زمین تک ایک پائپ ہے جو کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اصطلاح میں اس کو "تجدد امثال" کہتے ہیں۔ آنکھوں کی بینائی کے کل بھی ہم محتاج تھے اور آج بھی ہم محتاج ہیں اور کل بھی رہیں گے، بلکہ پل پل میں دیکھنے کے محتاج ہیں، پل پل میں سننے کے محتاج ہیں، پل پل میں بولنے کے محتاج ہیں، پل پل میں زندگی کے محتاج ہیں، پل پل میں ارادے، قدرت، سماعت اور کلام وغیرہ کے محتاج ہیں۔ یہ تمام صفات اُمہاتِ صفات میں سے ہیں، اس کے علاوہ دوسری صفات ان سب کی شاخیں ہیں، سینکڑوں نعمتیں ایسی بھی ہیں جو ہم خارج سے لیتے ہیں جیسے کھانا، پینا، کپڑے، عزت، تندرستی، خواہشات کی تکمیل، خوشیوں کا ملنا، کاموں کا بن جانا۔ ان سب میں ہم اللہ کے محتاج ہیں۔

ایک آدمی سفر کر رہا ہے تو وہ پہیے کے ہر ہر چکر پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا محتاج ہے، وہ گاڑی کے چلنے میں بھی محتاج ہے، مشین کے کام کرنے میں بھی محتاج ہے، اس کے بریک اور کلچ کے کام کرنے میں بھی وہ محتاج ہے، ایک گاڑی میں جتنے فنکشن (finctions) ہوتے ہیں ان سب میں وہ اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔ یہ صرف کسی ایک آدمی کی بات نہیں ہے بلکہ انسانوں کا ایک قافلہ اور سمندر ہے جو چلتا ہی جا رہا ہے۔ اور ان سب کے یہ سب کام اللہ پاک ہی کرتے ہیں، نہ اُن کو کوئی چیز حائل ہوتی ہے، اور نہ حارج ہوتی ہے۔ لوگ اپنی اپنی زبانوں میں، اپنے اپنے علاقوں میں، دنوں میں، راتوں میں، خلوتوں میں، جلوتوں میں اللہ سے مانگتے ہیں، اور سب کے سوال الگ الگ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کی سنتے ہیں اور سب کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ برّی مخلوق ہو یا بحری، انسان ہو یا جانور، سب اس سے مانگتے ہیں۔ اور سب کی ضرورتوں کو پورا وہ کرتے ہیں۔

﴿يَسْأَلُهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

جو کچھ زمین میں اور آسمانوں میں ہے وہ سب مجھ سے مانگتے ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾[۱]

اے لوگو! تم سب اللہ کے فقیر ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ غنی وحمید ہیں۔

باعتبارِ قربِ الٰہی انسان کے درجات:

(۱) فقیر اللہ:

بزرگوں کے نزدیک یہ بہت زیادہ مہتم بالشان مضمون ہے کہ آدمی پر اُس کا فقر اور اس کی محتاجگی کھل جائے۔ سب انسان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ میرا ہے، حالانکہ اس کا کچھ نہیں ہے، وہ تو "فقیر اللہ" ہے۔ اور انسانیت کی ابتدا ہی فقیر اللہ سے ہوتی ہے۔ اولاً وہ

۱: الفاطر: ۱۵۔

فقیر اللہ ہوتا ہے، پھر امین اللہ ہوتا ہے، امین اللہ سے ولی اللہ ہوتا ہے، ولی اللہ سے خلیفۃ اللہ ہوتا ہے، خلیفۃ اللہ سے عبد اللہ ہوتا ہے۔ چار مراحل سے گزر کر تب کہیں جاکر انسان کی عبدیت میں کمال آتا ہے۔

(۲) امین اللہ:

پہلے فقر کھلتاہے کہ سر کے بال سے لے کر پیر کے ناخن تک ایک ذرّہ بھی انسان کا نہیں ہے، جب آدمی اپنے آپ کو دیکھتاہے کہ نہ وجود میرا ہے، نہ صفات میری ہیں، نہ انفس میں میں ہوں، نہ آفاق میں میں ہوں، تو پھر یہ سوچتاہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ کس کا ہے؟ تو اس کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے، یہ سب اللہ کی امانت ہیں، جب اس کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ سب اللہ کی دی ہوئی امانتیں ہیں، اور امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں خیانت نہ کی جائے، اور امانت دینے والے کی مرضی کے خلاف اس میں تصرف نہ کیا جائے۔ اگر کوئی آپ کے پاس امانت رکھوائے اور آپ اُس میں تصرف کریں تو وہ بہت ہی بد تمیزی اور بد اخلاقی کی بات ہے۔ اس امانت کے صحیح استعمال کے لیے محمد رسول اللہ ہیں۔ امانت کے اقرار اور استحضار کے لئے "لا الٰہ الا اللہ" ہے۔ "لا الٰہ الا اللہ" کے ذریعے نبی اس مضمون کو سکھاتے اور سمجھاتے ہیں کہ ہمارا وجود اور ہماری نعمتیں سب امانت ہیں، اس لئے اپنی مرضی سے ہم اس میں کچھ تصرف نہیں کرسکتے، اگر اس کو استعمال کرنے کی اجازت ہے تو ویسی اجازت ہے جیسی "محمد رسول اللہ (ﷺ)" نے بتائی ہے۔

(۳) ولی اللہ (۴) خلیفۃ اللہ (۵) عبد اللہ:

جب آدمی محمد رسول اللہ (ﷺ) کے طریقے کے مطابق جانی و مالی، بیرونی و اندرونی امانتوں کو استعمال کرتا ہے تب وہ ولی اللہ ہوتا ہے۔ جب تک اس کی اصلاح اور

اس کے اعمال اس کی ذات تک ہوتے ہیں تو اس کو ولی اللہ کہتے ہیں، اور جب وہ غیروں کے لیے بھی ہوتے ہیں تو اس کو خلیفۃ اللہ کہتے ہیں۔ پھر جب انسان ان چار مراتب سے گزرتا ہے تو اس کی عبدیت میں کمال آجاتا ہے اور وہ عبد اللہ ہو جاتا ہے۔

اس کی ہر آن الگ شان ہے:

﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾

”وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے، سوائے جن وانس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟“

یہود کے ایک نظریہ کی تردید:

اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ یہود یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہفتے کے دن چھٹی کرتے ہیں۔ کوئی فیصلہ نہیں کرتے، اللہ پاک نے ان کی تردید میں یہ آیت اُتاری کہ وہ ہر دن ایک شان میں ہوتے ہیں، کسی دن بیکار نہیں ہوتے۔[1]

علماء نے لکھا ہے کہ دنیا کے اعتبار سے اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ بندوں کو ابتلاء اور امر و نہی کا اختیار دیتا ہے، زندگی اور موت دیتا ہے، کسی کو نعمتوں سے نوازتا ہے تو کسی کو محروم کرتا ہے، اور آخرت کے اعتبار سے اس کی شان یہ ہے کہ وہ بندوں کے حساب وکتاب، جزاوسزا، اور ثواب وعقاب کا معاملہ کرے گا۔

اس آیت کی وضاحت کے لئے صحابہ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اُن کی شان یہ ہے کہ وہ گناہوں کو معاف فرماتے ہیں، مصیبت اور پریشانیوں کو دور فرماتے ہیں، کسی کو پست اور ذلیل کرتے ہیں تو کسی کو بلند کرتے ہیں، اور عزت سے نوازتے ہیں۔[2] ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے کہ وہ مانگنے والوں کا سوال سنتے ہیں اور اس کو پورا کرتے ہیں۔[3]

---

[1]: تفسیرِ مظہری: ۱۵۱/۹۔ [2]: سنن ابنِ ماجہ: باب فی ما انکرت الجہمیۃ، ۲۰۲۔ [3]: روح المعانی: ۱۱۰/۱۴۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر روز تین فوجوں کو ایک عالم سے دوسرے عالم منتقل کرتے رہتے ہیں، باپ کی پشتوں سے رحمِ مادر میں لاکھوں نطفوں کو منتقل کرتے ہیں، پھر رحمِ مادر سے لاکھوں جانوں کو دنیا میں منتقل کرتے ہیں، اور لاکھوں لوگوں کو عالمِ دنیا سے عالمِ برزخ میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔[1]

ایک اشکال اور جواب:

یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب لکھا جاچکا ہے، اور قلم خشک ہوچکا ہے تو پھر اللہ پاک ہر دن نئی نئی شان میں کیسے ہوتے ہیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ: ''سُوْقُ الْمَقَادِیْرِ اِلَی الْمَوَاقِیْتِ''[2]

یہ مقادیر کو مواقیت میں لانا ہے۔ جو مقدر بنایا جاچکا ہے اُس کو سامنے لانا ہے۔

''کل یوم ھو فی شأن'' سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ:

ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا: ''کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَأْنٍ'' کا کیا مطلب ہے؟ وزیر کے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ بڑا محزون ہوا۔ اور پہلے کے بادشاہوں کا معاملہ یہ تھا کہ جواب دو، ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اسی لیے یہ مثل مشہور تھی کہ امیر کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے ہمیشہ بچو۔ امیر کے آگے مت رہو، پتا نہیں کب گولی ماردے اور گھوڑے کے پیچھے کبھی کھڑے مت رہو، پتا نہیں کب لات ماردے۔ بہر حال اس کی پریشانی دیکھ کر اس کے خادم نے اس سے پوچھا کہ صاحب! کیا بات ہے؟ آپ بڑے محزون اور غمگین نظر آرہے ہیں۔ وزیر نے کہا کہ بادشاہ نے یہ سوال کیا ہے اور میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے، خادم کہنے لگا کہ مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو، میں اُس کو سمجھادوں گا۔ وزیر اس کو بادشاہ کے پاس لے گیا، بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ:

---

[1]: روح المعانی: ۱۴/۱۱۰۔ [2]: تفسیر رازی: ۲۹/۳۶۲۔

بتاؤ ”کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ“ کا کیا مطلب ہے؟ خادم نے کہا کہ اے امیر! اس کی شان یہ ہے کہ وہ رات دن میں اور دن رات میں داخل کرتا ہے، زندہ کو مردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، صحت مند کو بیمار اور بیماروں کو شفا عطا کرتا ہے، جو عافیت میں ہے اس کو کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے اور جو مصیبت میں ہے اس کو عافیت بخشتا ہے۔ ذلیل کو عزیز اور عزیز کو ذلیل کرتا ہے، غنی کو فقیر اور فقیر کو غنی کرتا ہے، یہ اس کی الگ الگ شانیں ہیں، یہ سن کر بادشاہ نے کہا کہ تم نے میری الجھن دور کر دی، اللہ پاک تمہیں بھی کشادگی عطا فرمائے، یہ کہہ کر اس نے وزیر سے وزارت کا لبادہ نکال کر اس غلام کو پہنا دیا، تو اس غلام نے کہا کہ یہ بھی اللہ پاک کی شان ہے کہ وہ ایک غلام کو وزیر اور ایک وزیر کو غلام بنا رہا ہے۔[1]

”کل یوم هو فی شأن“ کی ایک اور تفسیر:

علماء نے لکھا ہے کہ شان کے ایک معنٰی خاص حالت اور تجلّی کے آتے ہیں۔ اور یہاں اس سے اللہ پاک کی تجلّی مراد ہے، یعنی اللہ پاک کی بے شمار تجلیات ہیں، اللہ پاک ان تجلیات کا ظہور فرماتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے دنیا میں یہ کام ہوتے ہیں۔[2] جلالی تجلّی فرماتے ہیں تو گنہگاروں کو سزا ملتی ہے، ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، آدمی مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھر جاتا ہے، اور جب جمالی تجلّی فرماتے ہیں تو بندوں کو عزت ملتی ہے، مصیبتیں اور پریشانیاں دور ہوتی ہیں، سزا، عذاب اور پکڑ سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے۔

اللہ پاک بندوں کے حساب کے لئے فارغ ہونے والے ہیں:

سَنَفۡرُغُ لَکُمۡ اَیُّہَا الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾

”اے جن و انس! ہم عنقریب تمہارے (حساب و کتاب کے لئے) فارغ ہو جاتے ہیں، سو تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

۱: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/۱۶۷۔ ۲: تفسیرِ حقانی: ۱۴/۴۵۹۔

یہاں سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے مضمون کا رُخ بدل دیا۔ دو قسم کے مضمون یہاں سے شروع ہو رہے ہیں۔ ایک تو ان سزاؤں، سختیوں اور مصیبتوں کا ذکر ہے جو گنہگاروں اور جہنمیوں کو دی جائیں گی، دوسرے ان نعمتوں کا ذکر ہے جو اہل جنت کو دی جائیں گی۔

حق تعالیٰ کے فارغ ہونے سے کیا مراد ہے؟

یہاں اللہ کی فراغت سے مخلوق کی طرح فراغت مراد نہیں ہے۔ دراصل یہ بندوں کو ڈرانے کے لئے ایک تعبیر اور اسلوب ہے۔ انسانوں میں فارغ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ فی الحال ایک کام میں مشغول ہیں، وہ کام دوسرے کام کرنے میں حارج اور مانع ہے، جب تک اُس کو ختم نہیں کیا جائے گا دوسرا کام شروع کرنا دشوار ہے، اللہ پاک کا اس طرح فارغ ہونا مراد نہیں ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے کوئی کام حارج نہیں، اُن کے لئے کوئی مشغولیت مانع نہیں، کیونکہ یہ ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ عیب سے سبحان ہیں۔

یہاں فراغت کا لفظ ایک تشبیہ اور استعارہ کے طور پر لایا گیا ہے، یعنی اس سے کسی بھی کام کی طرف مکمل توجہ بتانا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہم اس کام کے لئے فارغ ہیں۔ یعنی اب ہماری خاص توجہ اس کام پر ہوگی۔ اسی طرح اس آیت میں بھی فراغت سے یہی مراد ہے۔

چونکہ اس سے پہلی آیت میں ذکر کیا گیا کہ آسمان و زمین اور ان میں بسنے والی ساری مخلوقات اللہ پاک سے مانگتی رہتی ہے اور اللہ پاک انہیں دیتے رہتے ہیں اس اعتبار سے وہ ہر وقت ایک خاص حالت اور خاص شان میں ہوتے ہیں، تو اب اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ قیامت کے روز یہ معاملہ ختم ہو جائے گا، اللہ پاک اس وقت صرف ایک کام یعنی مخلوق کے حساب و کتاب، ثواب و عذاب کے لئے فارغ ہو جائیں گے۔[۱]

---

[۱] روح المعانی: ۱۴/ ۱۱۰۔

’’ثقلان‘‘کی تشریح:

اس آیت میں اللہ پاک نے انسان اور جنات کے لئے ثقلان کا لفظ استعمال کیا ہے۔اور ’’ثقل‘‘ کے معنیٰ بوجھ اور وزن کے ہیں۔یہاں ان کے لیے ’’ثقلان‘‘ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟

حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ’’مُثَقَّلَانِ بِالذُّنُوبِ‘‘[۱] یعنی ان کو ثقلان اس وجہ سے کہا گیا کہ وہ گناہوں کے بوجھ سے لدے ہوئے ہوتے ہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ احکام تکلیفیہ کا بوجھ انسان اور جنات پر ہے،اس لئے انہیں ثقلان کہا گیا ہے۔[۲]

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ’’ثقل‘‘ وزن دار، قیمتی، قابل قدر اور بلند مرتبہ چیز کی اہمیت بتانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔چونکہ کائنات میں سب سے زیادہ قیمتی، قابل قدر اور ذی حیثیت انسان اور جنات ہیں، اس لئے یہاں ان کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔[۳]

جیسا کہ ایک حدیث میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’اَنَاتَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ‘‘ میں تم میں دو ثقیل چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، ایک کتاب اللہ ہے اور دوسری میری عترت یعنی میرے خاندان والے ہیں۔[۴] اس حدیث میں عترت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آل اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی حدیث میں آپ نے فرمایا کہ جب تم اس کو مضبوط پکڑو گے تو گمراہ نہیں ہوگے،اور دوسری احادیث میں صحابہ اور ان کے راستے کو مضبوط پکڑنے کا حکم ہے، معلوم ہوا کہ یہاں صرف آلِ رسول مراد نہیں ہے،بلکہ سارے صحابہ اس میں شامل ہیں، فرق اتنا ہے کہ اہلِ بیت آل ہیں جسمانی اعتبار سے،اور صحابہ آل ہیں روحانی اعتبار سے۔حاصل یہ ہے

---

[۱]: تفسیر مظہری:۹/۱۵۱۔[۲]: تفسیر مظہری:۹/۱۵۱۔[۳]: حوالۂ سابق۔[۴]: مسلم:الفضائل،باب من فضائل علی بن ابی طالب۔

کہ انسان اور جنات کی قدر اور اہمیت بتانے کے لئے کہ انہیں کے ذریعہ دنیا میں رشد وہدایت کا کام ہو گا اور احکام تکلیفیہ کا بار انہیں پر ہے اس لئے انہیں ثقلان کہا گیا۔

حق تعالیٰ کا ایک چیلنج:

يَامَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ ﴿٣٣﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٤﴾

اے گروہِ جن وانس! اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو (ہم بھی دیکھیں گے) نکلو، مگر بدون زور کے نہیں نکل سکتے، سوائے جن و انس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

عدمِ فرار عدم قوت کی وجہ سے ہو گا، اگر بالفرض کوئی بھاگ بھی جائے گا تو اللہ پاک اس کے ساتھ ہوں گے، کہیں بھی وہ اللہ کے حساب سے خلاصی نہیں پائے گا۔

علماء نے آسمان وزمین سے فرار ہونے کا ایک مطلب یہ بیان کیا ہے کہ آدمی اگر اللہ پاک کی قدرت سے بھاگنا چاہے تو نہیں بھاگ سکتا، بعض نے کہا کہ اگر موت سے بھاگنا چاہے تو نہیں بھاگ سکتا، بعض نے کہا کہ آسمان وزمین کی معلومات حاصل کرنے کے لئے بھاگنا چاہے اور اس کے بارے میں جاننا چاہے کہ اس میں کیا کیا ہو رہا ہے؟ تو نہیں جان سکتا۔[1]

جنات کو مقدم کرنے کی وجہ:

اس آیت میں اللہ پاک نے جنات کو مقدم کیا ہے، اور انسانوں کو مؤخر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آسمانوں سے نکلنے کے لئے بڑی قوت اور قدرت کی ضرورت ہوتی ہے، اور انسانوں کے مقابلہ میں جنات کے پاس زیادہ قوت اور قدرت ہوتی ہے، اللہ پاک جنات کو مقدم کر کے اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ انسان تو انسان اگر جنات بھی

---

[1]: تفسیر قرطبی: ۱۷/۱۰۷۔ وروح المعانی ۱۴/۱۱۲۔

(جن کے پاس انسانوں کے مقابلہ میں کئی گناہ زیادہ قوت ہوتی ہے) اگر حق تعالیٰ سے یا اس کے حساب و کتاب اور عذاب سے یا محشر سے یا موت سے بھاگنا چاہیں تو بھاگ کر دکھائیں۔ جب وہ نہیں بھاگ سکتے تو انسان کیسے بھاگ سکتے ہیں؟[۱]

قربِ قیامت آسمان کا پھٹنا اور فرشتوں کا اترنا:

بعض علماء نے کہا کہ یہ آیت آخرت سے متعلق ہے، جب قیامت قائم ہوگی تو اللہ پاک آسمان کو حکم دیں گے تو وہ پھٹ جائے گا، اس کے بعد فرشتے رب العالمین کے حکم سے زمین پر اتریں گے، اسی کو قرآن نے کہا ہے:

﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا﴾[۲]

اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا۔ اور فرشتے بکثرت زمین پر اتارے جائیں گے۔

پھر وہ فرشتے صف بنائیں گے، آسمانِ اوّل کے فرشتے آئیں گے اور پورے میدانِ حشر کو صف بنا کر گھیر لیں گے۔ اس کے بعد آسمانِ دوم کے فرشتے آئیں گے۔ وہ اُس کے اوپر گھیر اڈال لیں گے۔ اسی طرح ساتوں آسمانوں کے فرشتے آئیں گے۔ اس کے بعد مَلکِ اعلیٰ آئیں گے (حدیث میں "مَلکِ اعلیٰ" کا لفظ ہے) ان لوگوں کے ساتھ جہنم ہوگی۔ اس جہنم کو دیکھتے ہی میدانِ حشر میں ایسی بھگدڑ مچے گی اور ایسی گھبراہٹ ہوگی کہ جس آدمی کو جدھر سوجھے گا وہ اُدھر ہی بھاگے گا۔ لیکن اس جگہ کو ساتوں آسمانوں کے فرشتے گھیرنے کی وجہ سے ان کو بھاگنے کا موقع نہیں ملے گا۔ پھر وہ لوگ دوبارہ اپنی جگہ پر ہی آکر کھڑے ہو جائیں گے۔[۳]

۱: تفسیرِ رازی:۳۶۵/۲۹۔ ۲: الفرقان:۲۵۔ ۳: تفسیر طبری:۳۱۹/۲۰۔

ایک جہالت کا ازالہ:

کچھ لوگ اس آیت سے خلائی اسفار کو جوڑتے ہیں، آج کل کی نئی نئی ایجادات راکٹ وغیرہ جو خلا میں چھوڑے جاتے ہیں ان سے آسمان اتنی دور ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ سطحِ آسمان کے یہ بہت نیچے ہیں، اس آیت کا آسمان کے حدود سے باہر جانے کا کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہاں آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اللہ پاک کی قدرت اور کنٹرول سے باہر نکلنا چاہے تو نہیں نکل سکتا، اس لئے اس آیت کو خلائی سفروں کے ساتھ جوڑنا محض بے وقوفی ہے۔[۱]

جہنم کے شعلے اور دھواں:

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

تم پر آگ کا شعلہ اور تانبے کا دھواں چھوڑا جائے گا، پھر تم اپنا بچاؤ نہیں کر سکو گے، سوائے جن وانس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

”شواظ“ آگ کے اس شعلہ کو کہا جاتا ہے جس میں دھواں نہ ہو، اور نحاس اس دھویں کو کہا جاتا ہے جس میں آگ نہ ہو۔[۲]

جہنمیوں کو یہ عذاب ہوگا کہ ان پر آگ ہی آگ ہوگی، دھواں نہ ہوگا، یا پھر دھواں ہی دھواں ہوگا، جس میں کوئی روشنی نہیں ہوگی، اور وہ کہیں بھی جا نہ سکیں گے، اور وہ دھواں ایسا ہوگا کہ آدمی کو نہ سانس لینے دے گا اور نہ سانس چھوڑنے دے گا۔ دھویں کی سزا الگ ہوگی اور آگ کی سزا الگ ہوگی۔ یا نحاس سے مراد تانبہ ہے جو ان پر پگھلا کر ڈالا جائے گا۔[۳]

۱: معارف القرآن۔ ۲: تفسیر قرطبی: ۱۷/۱۷۱۔ ۳: تفسیر مظہری: ۹/۱۵۳۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اگر جنات اور انسان آسمانوں کو پار کر کے اللہ پاک سے چھپ کر کہیں جانا چاہیں تو ان پر آگ ہی آگ اور دھواں ہی دھواں ہو گا، وہ اللہ پاک سے چھپ کر کہیں جانہ پائیں گے۔[1]

وہاں کی آگ اور دھواں معمولی نہیں ہو گا، وہاں کی آگ یہاں کی آگ سے ستر گنا زیادہ سخت ہو گی، دنیا میں آدمی اپنی انگلی چراغ یا شمع میں پانچ یا دس سیکنڈ کے لیے نہیں رکھ سکتا تو وہاں کی آگ اور عذاب کو کیا جھیل پائے گا؟

دنیا کی آگ جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے:

حدیثوں میں آتا ہے کہ اگر کسی آدمی کو جہنم کی آگ سے نکال کر دنیا کی آگ میں پھینک دیا جائے تو وہ سو جائے گا۔ کیونکہ آدمی کو بڑی تکلیف کے بعد چھوٹی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ جہنم کی آگ کو ستر گنا کم کیا گیا تب جا کر دنیا کی آگ بنی۔[2]

جہنم کی چنگاریاں محلات کی طرح ہوں گی:

اس کی چنگاریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿اِنَّهَا تَرۡمِیۡ بِشَرَرٍ كَالۡقَصۡرِ﴾[3]

”بے شک وہ پھینکتا ہے چنگاریاں جیسے کہ بڑے بڑے محل“

”رمی“ کے معنی پھینکنے کے ہیں، ”شرر“ کے معنی چنگاری کے ہیں، وہ جہنم یا دھواں پھینکتا ہے ایسی چنگاریاں جو بڑے بڑے محلات کی طرح ہوں گی، جس کی چنگاریوں کا یہ حال ہو تو پھر آگ کا کیا حال ہو گا؟ اور وہ آدمی پر برسائی جائے گی، اندازہ لگائیے کہ جس پر یہ عذاب ہو گا اس کا کیا ہو گا؟ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں:

۱: تفسیر قرطبی: ۱۷/۱۷۱۔ ۲: صحیح بخاری: کتاب بدء الخلق، باب صفۃ النار وانھا مخلوقۃ۔ ۳: المرسلات: ۳۲۔

اے جنات اور اے انسانو! تم پر آگ کے شعلے چھوڑے جائیں گے اور دھویں کے بادل چھوڑے جائیں گے، اور تم ایک دوسرے کی مدد بھی نہ کر سکو گے۔ نہ اللہ کے عذاب سے بچانے میں، نہ موت سے بھاگنے میں نہ میدان محشر سے بھاگنے میں نہ آسمان وزمین سے بھاگنے میں۔

آسمان پھٹ کر سرخ ہو جائے گا:

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾

غرض جب (قیامت آئے گی جس میں) آسمان پھٹ جاوے گا اور ایسا سرخ ہو جاوے گا جیسے سرخ نری (یعنی چمڑا) سوائے جن و انس! تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

یہ آسمان کا پھٹنا فرشتوں کے نزول کے لئے ہو گا، اور ایسا قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد ہو گا۔[۱]

ایک روایت میں ہے کہ آسمان اس وقت رنگا رنگ ہو جائے گا، کبھی اس کا رنگ تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو گا تو کبھی سرخ ہو گا۔ مفسرین نے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ آسمان زیتون کے تیل کی طرح ہو جائے گا، اور یہ اس وقت ہو گا جب جہنم کی گرمی اس پر اثر انداز ہو گی۔[۲]

آسمان کے سرخ نظر آنے کی وجہ:

آسمان قرب قیامت جو سرخ ہو گا تو اس کی وجہ تحریر کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ متقدمین کے نزدیک اصل آسمان کا رنگ سرخ ہی ہے، درمیان میں کئی چیزوں کے حائل ہونے اور مسافت کے دور ہونے کی وجہ سے اس کا رنگ نیلا نظر آتا ہے، جیسے

۱: تفسیر مظہری: ۹/ ۱۵۳۔ ۲: تفسیر مظہری: ۹/ ۱۵۴۔

کہ رگیں ہیں، ان میں لالی ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ نیلی نظر آتی ہیں، اسی طرح آسمان فی الحال تو نیلا نظر آتا ہے لیکن کل قیامت کے موقع پر اس کا اصلی رنگ نظر آئے گا۔[۱]

گنہگاروں سے سوال کی نوعیت:

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾

تو اس روز کسی انسان اور جن سے اسکے جرم کے متعلق نہ پوچھا جائے گا، سوائے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ کسی انسان اور کسی جن سے سوال نہیں کیا جائے گا، جبکہ قرآن پاک میں کئی مواقع پر اللہ پاک نے فرمایا کہ ان سے سوال کیا جائے گا، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾[۲]

چنانچہ تمہارے رب کی قسم ہم ایک ایک کر کے ان سب سے پوچھیں گے۔

اس اعتراض کے علماء نے کئی جواب دئے ہیں،

(۱) قیامت کا دن کافی طویل ہوگا، اس میں کسی وقت سوال ہوگا اور کسی وقت نہیں۔

(۲) قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پہلے ان سے سوال کیا جائے گا، وہ قسمیں کھا کر جھوٹ بولیں گے تو ان کے منہ پر مہر لگادی جائے گی، پھر ان سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

(۳) جب ان کو آگ میں ڈال دیا جائے گا تو اس وقت ان سے سوال نہیں کیا جائے گا۔[۳]

(۴) فرشتے جو گنہگاروں کے عذاب پر مامور ہیں انہیں پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ وہ گنہگاروں کے چہرے دیکھ کر پہچان لیں گے اور انہیں جہنم میں ڈال دیں گے۔[۴]

۱: تفسیرِ قرطبی:۱۷/۱۷۳۔ ۲: الحجر:۹۲۔ ۳: تفسیر قرطبی:۱۷/۱۷۴۔ ۴: تفسیر قرطبی:۱۷/۱۷۴۔

(۵) بعض حضرات نے کہا کہ حشر میں حساب وکتاب کے وقت تو سوال ہو گا لیکن قبروں سے نکلتے وقت سوال نہیں ہو گا۔[۱]

(۶) ان کے اعمال کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا؟ اور کیا نہیں کیا؟ بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ جہاں سوال کا ذکر ہے تو وہاں سوال سے مراد کیوں کا سوال ہے یعنی زجر و توبیخ والا سوال مراد ہے۔ اور جہاں سوال نہ کرنے کا ذکر ہے تو وہاں گناہ اور اعمال کا سوال مراد ہے۔[۲]

ویسے آدمی کے سارے اعمال تو اللہ پاک کے علمِ ازلی میں پہلے ہی سے ہیں، انہیں سوال کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بندوں پر تکمیل حجت کے لئے ان کے اعمال لکھے جاتے ہیں، اور ان کا سوال کیا جاتا ہے:

﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾[۳]

(ہائے ہماری بربادی!) یہ کیسی کتاب ہے جس نے ہمارا کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں چھوڑا جس کا پورا احاطہ نہ کیا ہو"۔

انسان کے اعضاء خود اس کے خلاف گواہی دیں گے:

فرشتوں کے پاس بھی ان کا اعمال نامہ محفوظ ہو گا، ان کے علاوہ خود انسان کے اعضاء کے پاس بھی اس کا ریکارڈ ہو گا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾[۴]

آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے، اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کمائی کیا کرتے تھے۔

۱: روح المعانی: ۱۴/ ۱۱۳۔ ۲: تفسیر قرطبی: ۱۷/ ۱۷۴۔ ومظہری۔ ۳: الکھف: ۴۹۔ ۴: یٰس: ۶۵۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قیامت میں سب سے پہلے آدمی کی بائیں ران بولے گی کہ یہاں سے کیا کیا اعمال صادر ہوئے ہیں؟“[1]

انسان کے اعضاء خدا کے کیمرے:

اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم کا ایسا نظام رکھا ہے کہ جب بھی اس سے کوئی عمل صادر ہوتا ہے تو وہ اس کی فوٹو لے لیتا ہے۔ اور وہ اس کیمرے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

جب نامۂ اعمال اور آدمی کے اعضاء گواہی دیں گے تو اس سے سوال کیا جائے گا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ کسی کے گناہ کے بارے میں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تو نے یہ کیا ہے یا نہیں؟ بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ تجھے ہمت کیسے ہوئی؟ کیا تو اپنے خدا کو بھول گیا تھا؟ اُس کی عظمت کو بھول گیا تھا؟ اُس کے عذاب کو بھول گیا تھا؟ اُس کی سزا کو بھول گیا تھا؟ آخر تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا؟۔ یہ سوال کل آدمی سے ہوگا۔

مجرموں کی شناخت ان کے چہروں سے ہوگی:

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْأَقْدَامِ ﴿٤١﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٢﴾

مجرم لوگ اپنے حلیہ سے (کہ سیاہی چہرے و نیلگوں چشم ہے) پہچانیں جائیں گے، سو ان کے سر کے بال اور پاؤں پکڑ لئے جائیں گے، سوائے جن وانس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

ایک دفعِ دخلِ مقدر:

یہ آیت دراصل ایک اعتراض کا جواب ہے کہ جب مجرموں سے ان کے جرم کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا تو فرشتوں کو کیسے پتہ ہوگا کہ وہ جہنمی ہیں؟ اس کا جواب

---

[1]: صحیح مسلم: کتاب الزہد والرقاق: ۲۹۶۸/ ۲۔

یہ ہے کہ فرشتے ان کے چہرے دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ گنہگار ہیں، چہرے سیاہ ہوں گے اور آنکھیں نیلی ہوں گی۔

گنہگاروں کے چہروں کی کیفیت:

گنہگاروں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿فَأَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾[1]

چنانچہ جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے (آنکھیں پھٹی پھٹی ہوں گی، چہرے پر غم چھائے ہوئے ہوں گے) ان سے کہا جائے گا کہ: کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کرلیا؟ لو اب مزہ چکھو اس عذاب کا، کیونکہ تم کفر کیا کرتے تھے۔

فرشتوں کی پکڑ سے کمر ٹوٹ جائے گی:

کل قیامت میں جب فرشتے مجرمین کو علامتوں کے ذریعہ پہچان لیں گے تو ان کے پیر اور سر کے بال اس طرح پکڑیں گے کہ ان کی پیٹھ ٹوٹ جائے گی۔ پھر ان کو گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ کچھ آدمیوں کو پیشانی پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈالا جائے گا اور کچھ کو پیر پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈالا جائے گا۔[2]

نیک مومنین کی پہچان:

﴿وَأَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللهِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ۔ تِلْكَ آيَاتُ اللهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِيْنَ﴾[3]

جن لوگوں کے چہرے چمکتے ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں جگہ پائیں گے، وہ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا رہے ہیں، اور اللہ دنیا جہاں کے لوگوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

---

[1]: آل عمران: ۱۰۶۔ [2]: تفسیر قرطبی: ۱۷/۱۷۵۔ [3]: آل عمران: ۱۰۷ و ۱۰۸۔

یتیموں کا مال کھانے والوں کی نشانی:

ایسے ہی جب فرشتے یتیموں کا مال کھانے والوں کو دیکھیں گے تو ان کے چہروں سے انہیں پہچان لیں گے، اور آپ ﷺ نے ان کی یہ نشانی بیان فرمائی کہ وہ کل قیامت میں اس حالت میں اُٹھیں گے کہ آگ کے شعلے اُن کے منہ سے نکل رہے ہوں گے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا﴾[۱]

یقین رکھو کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔

یہاں دنیا میں انہوں نے اپنے پیٹ میں کھانا بھرا تھا لیکن کل قیامت میں وہ آگ ہی ہو گی، جب وہ قبروں سے اٹھیں گے تو اُن کے منہ سے آگ کے شعلے باہر نکل رہے ہوں گے۔[۲] فرشتے اُنہیں دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔

سود خوروں کی نشانی:

سود خور جب قبروں سے اٹھیں گے تو اس حال میں اٹھیں گے جیسے کہ ایک مخبوط الحواس اور آسیب زدہ آدمی اٹھتا ہے، فرشتے انہیں دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ یہ لوگ فلاں گناہ میں مبتلا تھے۔[۳]

جیسے کسی آدمی پر جن چڑھ گیا ہو تو اُس کو ہوش نہیں رہتا، وہ اِدھر اُدھر جھوم رہا ہوتا ہے اور طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور دیکھنے والا فورًا سمجھ جاتا ہے کہ یہ آدمی اپنے قابو میں نہیں ہے۔ ایسے ہی کل جب یہ اپنی قبر سے اٹھے گا اور فرشتے اس کو دیکھیں گے تو فورًا سمجھ جائیں گے کہ دنیا میں یہ سود کھانے والا تھا۔

۱: نساء:۱۰۔ ۲: تفسیرِ مظہری ۹/۱۵۵۔ ۳: تفسیرِ مظہری:۹/۱۵۵۔

اسی کا ذکر کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾[1]

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں اُٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔

چغلخوروں کی نشانی:

حدیث میں آیا ہے کہ جو آدمی اِدھر کی بات اُدھر لگاتا ہے، اِن کو اُن سے لڑوا دیا اور اُن کو اِن سے لڑوا دیا۔ ایسے آدمی کے دو چہرے ہوں گے اور آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔[2] وہ خود اپنی زبانوں سے پریشان ہو گا۔ فرشتے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔

زکوٰۃ نہ دینے والوں کی نشانی:

جس نے زکوٰۃ ادا نہیں کی ہو گی اُسے زکوٰۃ کا مال سانپ بن کر لپٹا ہوا ہو گا اور اس کے جبڑوں کو پکڑا ہوا ہو گا۔[3] فرشتے دیکھتے ہی اُسے بھی پہچان لیں گے۔

جس نے بکری اور اونٹ کی زکوٰۃ ادا نہیں کی ہو گی وہ بکریاں اُسے سینگ مار رہی ہوں گی اور اُسے روند رہی ہوں گی۔[4]

غاصبین کی نشانی:

جس نے کسی کا مال غصب کیا ہو گا تو وہ مال اُس کے ساتھ ہو گا۔

جس کسی نے کسی کی زمین بالشت بھر بھی غصب کی ہو گی تو وہ زمین اُس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دی جائے گی۔[5]

۱: البقرۃ:۲۷۵۔ ۲: مصنف ابن ابی شیبہ:۱۰۶/۶ -۱۰۷۔ ۳: صحیح بخاری: کتاب الزکاۃ/ باب اثم مانع الزکاۃ۔
۴: صحیح مسلم/ کتاب الکسوف/ باب اثم مانع الزکاۃ۔ ۵: صحیح بخاری: کتاب المظالم/ باب ماجاء فی سبع ارضین۔

متکبرین کی نشانی:

جو متکبر بڑے بڑے بادشاہ ہوں گے وہ لوگوں کے مقابلے میں چیونٹیوں کی طرح ہوں گے۔[۱] خاص طور پر اُس دن ایسے لوگوں کو چھوٹا بنا کر اُٹھایا جائے گا تاکہ اُن کی ذلت ظاہر ہو اور لوگوں کو اُن کی حقیقت کا پتا چل جائے کہ یہ فرعون ہے، یہ ہامان ہے، یہ شداد ہے، دنیا میں لوگ جسے بڑا سمجھتے تھے آج ان کی یہ حیثیت ہے۔

غرض یہ کہ ہر آدمی کی اپنے گناہ کے اعتبار سے ایک خاص نشانی ہو گی، اور وہ خاص عذاب میں مبتلا ہو گا، فرشتے اسے دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔

اسی کا ذکر کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمَاهُمْ﴾

مجرم اپنی خاص علامتوں اور نشانیوں کی وجہ سے پہچان لئے جائیں گے۔

جہنم کی گہرائی:

ہزاروں قسم کے لوگ ہزاروں قسم کے گناہوں میں مبتلا ہوں گے، اور ہر کوئی اپنی اپنی خاص علامت کے اعتبار سے پہچان لیا جائے گا اور فرشتے ان کے سر کے بال پکڑیں گے اور پیر پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیں گے، ان کو جب جہنم میں ڈالا جائے گا تو پچاس ہزار سال تک اس کی گہرائی میں اترتے جائیں گے۔[۲]

قیامت کے دن کی ہولناکی:

وہ دن اتنا سخت ہو گا کہ بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ دنیا میں چاہے کتنا ہی بڑا حادثہ کیوں نہ ہو، کسی بچے کے بال اچانک سفید نہیں ہوتے، لیکن وہاں صرف قیامت کی ہیبت اور وحشت کو دیکھ کر بچوں کے بال سفید ہو جائیں گے۔ پچاس ہزار سال کا دن ہو گا، ایک

۱: سنن ترمذی: باب من ابواب صفۃ القیامۃ والرقاق والورع۔ ۲: تفسیر ابن کثیر: ۲۴۲/۵۔

ہزار سال کا ایک پیریڈ ہو گا، موقف الظلمت میں ہزار سال نکل جائیں گے، قبر سے اُٹھنے میں ہزار سال لگ جائیں گے، ہزاروں سال تک ننگے پیر، ننگے جسم، بھوکے اور پیاسے کھڑے رہیں گے۔ وہ دن انسانوں کے لیے اتنی شدت اور تکلیف والا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی شدت اور تکلیف کو بتانے کے لئے قرآن پاک میں دو سو سے زائد جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ جس دن کی سختی کو اللہ تعالیٰ اتنا سخت بتا رہے ہوں تو اندازہ لگایئے کہ وہ کتنا سخت اور تکلیف دہ دن ہو گا؟

حمیم اور آن کی تفسیر:

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

یہ وہ جہنم ہے جسے مجرمین جھٹلاتے تھے، وہ لوگ دوزخ کے ارد گرد کھولتے ہوئے پانی کے درمیان دورہ کرتے ہوں گے۔ سو اے جن و انس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھلاؤ گے؟

”حمیم“ کھولتے ہوئے اور ”آن“ انتہائی گرم پانی کو کہتے ہیں۔

آن کی تفسیر میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ آن وہ انتہائی گرم پانی ہے جسے آسمان اور زمین کی پیدائش سے اب تک پکایا جارہا ہے۔ اور جب جہنمی پانی مانگیں گے تو یہ پانی پینے کے لئے انہیں دیا جائے گا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آن جہنم کی ایک وادی کا نام ہے، جس میں اہلِ جہنم کا پیپ جمع ہوتا ہے، جس میں وہ غوطے لگائیں گے، جس کی وجہ سے ان کی کھال ادھڑ جائے گی۔ پھر ان کو اس سے نکالا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ نئی خلقت عطا فرمائیں گے، پھر ان کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، ان کے ساتھ مسلسل یہی معاملہ کیا جاتا رہے گا۔[۱]

۱: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/۱۷۵۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ جہنمی دو مرتبہ چکر لگائیں گے، ایک مرتبہ جحیم میں اور ایک مرتبہ حمیم میں۔ جحیم آگ کا اور حمیم گرم کھولتے ہوئے پانی کا نام ہے۔[۱]

اہلِ جہنم کے لئے پیش کردہ پانی کی سختی:

گنہگار گرم اور انتہائی جوش مارتے ہوئے پانی اور جہنم میں چکر لگا رہے ہوں گے۔ وہاں پر اتنی بھوک مسلط کی جائے گی کہ آدمی کہے گا کہ کھانے کے لئے کچھ چاہیے۔ جب اُس کو کھانا دیا جائے گا تو وہ اُس کے گلے میں پھنس جائے گا۔ ایسی کیفیت میں آدمی نہ زندہ ہو گا اور نہ مرے گا۔ ایسی حالت میں ایک نہیں بلکہ ہزاروں جہنمی ہوں گے، وہ لوگ آپس میں یاد کریں گے کہ جب دنیا میں ہمارے حلق میں کھانا پھنستا تھا تو پانی کے ذریعے اُس کو حلق سے نیچے اُتارتے تھے، چلو پانی مانگتے ہیں، وہ پانی کے لئے چلائیں گے، جب پانی آنکڑوں کے ذریعے اُن کے قریب کیا جائے گا تو اُن کے چہرے بھن جائیں گے، اور پیٹ کے اندر پہونچے گا تو انتڑیاں کٹ کر نیچے گر جائیں گی۔[۲] ہونٹ اُس پانی کی گرمی سے جھلس کر نیچے لٹک جائیں گے اور جیسے ہی وہ پانی اُن کے گلے میں ڈالا جائے گا تو وہ پانی کھانے کے ساتھ گلے اور آنتوں کو گلا دے گا اور ٹکڑے ٹکڑے بنا دے گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پاخانے کے راستے سے نکل جائے گا۔[۳] اُس وقت جو تکلیف ہو گی وہ تو ہو گی، بعد میں انہیں پھر صحیح کیا جائے گا، اور دوبارہ اس عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ اور مسلسل ان کے ساتھ اس طرح کیا جائے گا۔

اہلِ جہنم کی جسامت:

یہ سزائیں دنیوی چھوٹے سے جسم کو نہیں دی جائیں گی، بلکہ اس کے لیے جہنمی کے جسم کو بہت بڑا کیا جائے گا یہاں تک کہ اُس کا ایک داڑھ احد پہاڑ کے برابر کیا جائے گا۔

۱: حوالہ سابق۔ ۲: تفسیرِ مظہری: ۱۵۶/۹۔ ۳: سنن ترمذی: باب ما جاء فی صفۃ طعام وشراب اھل النار۔

بتیس دانت بتیس احد پہاڑ کے برابر ہوں گے، اب آپ اندازہ لگائیے کہ صرف اُس کا منہ کتنا بڑا ہو گا۔ اُس کے ایک مونڈھے سے دوسرے مونڈھے کی مسافت تین دن کی ہو گی۔[۱] اگر گنہگاروں کو جہنم میں پروانوں کی طرح سے ڈالا جائے گا تو جہنم میں جانے سے پہلے ہی وہ ختم ہو جائیں گے، اس لئے اسی اعتبار سے ان کا جسم بنایا جائے گا۔ جب جہنمی کو وہاں پر جلایا جائے گا تو اُس کے جسم کا غسیلہ انتہائی بدبودار پیپ اور بہتا ہوا خون ہو گا۔ ہر جہنمی سے اس کے غسیلے کی ایک نہر بہتی ہوئی ہو گی، اسی کو "آن" کہتے ہیں۔[۲] اسی میں جہنمیوں کو ڈالا جائے گا اور پیاس کے وقت اسی کو پینے کے لئے کہا جائے گا۔ یہ کتنی سخت اور تکلیف دہ جگہ ہے! اللہ تعالیٰ مجرموں، ظالموں اور غلط کاروں کو پکڑ کر ایسی ایسی سزائیں دیں گے، یہ ساری انسانیت پر کتنا بڑا انعام اور احسان ہے اس لئے جگہ جگہ فرمایا: "فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ"

اب کیا ارادہ ہے؟ کیا ابھی بھی اُسی طرح مستیاں کرنے کا ارادہ ہے، یا اپنی زندگی میں سدھار لانا ہے؟

انہیں حالات کے پیش نظر آپ ﷺ نے جہنم سے پناہ مانگی ہے اور اس سے پناہ مانگنے کی ترغیب دی ہے۔ اس لئے آدمی کو جہنم کا تذکرہ کثرت سے کرنا چاہئے، تاکہ گناہوں سے بچنا اس کے لئے آسان ہو۔

ایک بزرگ کا ملفوظ:

ایک بزرگ نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ ہمارے لیے جنت اور جہنم تذکرے کی چیز ہے، لیکن صحابہ کے لیے جنت اور جہنم تذکرے کی چیز نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ انہوں نے اس کی ایک مثال دی کہ دو چار آدمی بیٹھے ہوئے ٹیبل ٹاک کر رہے ہیں اور

۱: صحیح مسلم: کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واھلھا، باب النار یدخلھا الجبارون الخ۔ ۲: فتح القدیر: ۱۶۶/۵۔

وہاں ایک پلاسٹک کا سانپ رکھا ہوا ہے، جس پر ان کا تبصرہ چل رہا ہے، کوئی کہہ رہا ہے کہ اس کی لمبائی کتنی زیادہ ہے؟ کوئی کہہ رہا ہے کہ اس کا رنگ کتنا خطرناک ہے؟ کوئی کہہ رہا ہے کہ وہ کتنا موٹا ہے؟ اسی درمیان ایک اصلی سانپ اوپر سے ٹیبل پر گرتا ہے، تو کیا اب بھی تبصرہ جاری رہے گا؟ نہیں! بلکہ اُس کو دیکھتے ہی بھگدڑ مچ جائے گی۔ صحابہ کے لیے جہنم اس اصلی سانپ کی طرح تھی، اور آج ہمارے لئے جہنم کا تذکرہ پلاسٹک کے سانپ کی طرح ہے، اس لیے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے جہنم کا تذکرہ آتا تو چہرے زرد ہو جاتے، طبیعتوں پر مایوسی چھا جاتی تھی۔ لیکن ہم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، کیونکہ جہنم کی حقیقت ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو اس کی حقیقت سمجھائے اور اس سے بچائے۔

خوفِ الٰہی کے انعامات:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہتا ہے اسکے لئے (دو باغ ہیں)۔ سو (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

گزشتہ آیات میں بندوں کے لئے ترھیبی مضمون تھا، ان آیات میں ترغیبی مضمون ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک عادت ہے کہ جب بندوں کو سزا اور پکڑ کا مضمون سنا کر ڈراتے ہیں اور اپنی صفاتِ جلال کا تعارف کرواتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ صفاتِ جمال کا بھی تعارف کروا دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ترہیبی مضمون سے مایوسی اور کفر کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے ترغیبی مضمون بھی ذکر کر دیتے ہیں، تاکہ بندوں میں امید بھی پیدا ہو جائے۔ اسی لیے مشہور مقولہ ہے:

"اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ" ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔

نعمتوں کے سننے سے اُمید پیدا ہوتی ہے، حق تعالیٰ کی رحمت سامنے آتی ہے، آدمی میں ایک شوق، رغبت اور اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کچھ اس مضمون کا ذکر بھی مناسب ہوتا ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ نقل فرمایا ہے کہ زمانۂ شباب میں خوف کا مضمون زیادہ سننا اور سنانا چاہیے، کیونکہ جوانی میں آدمی کا میلان زیادہ تر گناہوں کی طرف ہوتا ہے، نفس انگڑائیاں لینے لگتا ہے، اور اپنی خواہشات پر چلنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے، اور دنیا بھی اُسے اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے، ایسے وقت جہنم کا ذکر اور اس کی تکالیف کا ذکر زیادہ مناسب ہوتا ہے، تاکہ خوفِ خدا پیدا ہو اور گناہ کی ہمت نہ ہو۔

اور زمانۂ شیوخت اور بڑھاپے میں رجاء (اُمید) کا مضمون زیادہ سننا اور سنانا چاہیے، (تاکہ اُمید غالب ہو) کیونکہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ سے ملاقات کا وقت قریب ہو تو آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس اچھی اُمید کے ساتھ جائے۔ کیونکہ بندہ کا جیسا گمان ہوتا ہے ویسا ہی اللہ پاک اس کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔

”اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ“[1]

میں اپنے بندے کے مجھ سے گمان کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے اچھا گمان رکھتا ہے تو میں اُس کے ساتھ اچھا ہی برتاؤ کرتا ہوں۔

”وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ“ میں ”ربّ“ ذکر کرنے کی وجہ:

اس آیت میں اللہ پاک نے خوف کے ساتھ ”رب“ کو بیان فرمایا ہے، اور ”رب“ کے معنی ہے، پالنے والا اور نعمتیں عطا کرنے والا، اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ کل قیامت میں نعمتوں کی پوچھ گچھ ہونے والی ہے، اور نعمتوں کے بارے میں سوال کرنے والی وہی ذات ہے، جو دنیا میں نعمتیں دینے والی تھی، اور پالنے والی تھی، تاکہ اس استحضار سے آدمی شرمندہ ہو اور اس کے اندر سے ناشکری اور نافرمانی ختم ہو۔

---

[1] صحیح بخاری: کتاب التوحید/باب قول اللہ ویحذرکم اللہ نفسہ۔

وَلِمَنْ خَافَ کا شانِ نزول:

مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ قیامت، میزان، جنت اور دوزخ کے بارے میں سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا، کاش میں گھاس ہی ہوتا اور کوئی چوپایہ مجھے کھالیتا اور میرا حساب وکتاب ہی نہ ہوتا تو حق تعالیٰ شانہٗ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔[۱]

رب کے سامنے خوف اور قیام کا مطلب:

اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا مطلب قیامت میں اس کے سامنے حساب وکتاب کے لئے پیش ہونا ہے۔

اور ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں آدمی کو یہ فکر ہو کہ مجھے اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے، اپنی زندگی کا حساب دینا ہے۔ وہاں کے سوالات کا جواب دینا ہے، اس طرح مراقبہ کر کے آدمی منکرات اور معاصی سے رک جائے (تو اس کے لئے ان جنتوں کا وعدہ ہے۔[۲]

سوالاتِ خمسہ سے کسی کو مفر نہیں:

کیونکہ حدیث میں آتا ہے:

"لَاتَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰی یُسْاَلَ عَنْ خَمْسٍ"[۳]

ابنِ آدم کے قدم اپنے رب کے سامنے سے ہٹ نہیں سکتے جب تک کہ پانچ چیزوں کے بارے میں اُس سے پوچھ نہ لیا جائے، میں نے تجھے عمر دی تھی، تو نے کس میں فنا کی؟ جوانی دی تھی کس میں خرچ کی؟ مال دیا تھا، کہاں سے کمایا تھا؟ اور کہاں خرچ کیا؟ علم دیا تھا، اُس پر کتنا عمل کیا؟

۱: روح المعانی: جزء ۱۴/۱۱۶۔ ۲: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/۱۷۶۔ ۳: سنن ترمذی: صفۃ القیامۃ/باب فی القیامۃ۔

روزِ قیامت حق تعالیٰ براہِ راست سوال فرمائیں گے:

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بندے کو براہِ راست اپنے سامنے کھڑا کریں گے:

”مَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا وَسَيُكَلِّمُهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ بَيْنَ اللّٰهِ وَبَيْنَهٗ تَرْجُمَانٌ“[۱]

”اللہ تبارک وتعالیٰ اور بندے کے درمیان کوئی ترجُمان نہیں ہو گا، کوئی مترجم اور ٹرانسلیشن کرنے والا (Translator) نہیں ہو گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ براہِ راست بندے سے بات کریں گے، اوراُس سے سوال کریں گے۔ اب آپ اندازہ لگائیے کہ آدمی کی کیا حالت ہو گی؟ وہاں پوری زندگی کا حساب لیا جائے گا، ہم ایک دن کا کیا ایک گھنٹے کا بھی حساب نہیں دے پائیں گے۔

حسابِ یسیر کی دعا مانگنی چاہیے:

اسی لیے حضور پاک ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو اپنی نماز میں یہ دعا مانگتے ہوئے سنا: ”اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا“ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ”حسابِ یسیر“ کیا ہے؟ فرمایا کہ نامۂ اعمال پر نظر ڈالی جائے اور چھوڑ دیا جائے۔[۲] اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: حسابِ یسیر ”العرض“ ہے، یعنی پیش کرنا ہے کہ یہ ہے تمہارا نامۂ اعمال، اسے لے لو۔

لیکن جس سے یہ پوچھا گیا کہ تو نے یہ ”کیوں“ کیا تو وہ ہلاک ہو جائے گا: ”مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ يُهْلَكْ“[۳]

۱: صحیح البخاری: کتاب الزکاۃ/باب الصدقۃ قبل الرد۔ ۲: مستدرکِ حاکم: کتاب الاحوال: ۸۷۲۷۔
۳: صحیح بخاری: کتاب العلم/باب من سمع شیئا فراجع حتی یعرفہ، ۱۰۳۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر وقت اس بات کا استحضار رکھے کہ حق تعالیٰ شانہ اس کے ہر قول و عمل پر نگران ہیں۔[1]

بندہ کو ہمیشہ اس کا مراقبہ اور استحضار رہے۔ یہ اور پہلے والا مطلب قریب قریب ہے۔

اس صورت کا بھی حاصل یہی ہے کہ آدمی اللہ سے ڈر کر زندگی گزارے گا، اور معاصی سے اجتناب کرے گا تو وہ جنتوں کا مستحق ہو گا۔

خوف اور خشیت میں فرق:

یہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے خوف کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور دوسری جگہ خشیت کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

جیسے ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾[2]

خشیت کے معنیٰ بھی ڈر کے ہیں، اور خوف کے معنیٰ بھی ڈر کے ہیں لیکن خشیت اور خوف میں فرق ہے۔ خوف کہتے ہیں اپنے ضعف، عاجزی، اور ذلت کی طرف نظر کرتے ہوئے ڈرنا، کیونکہ سب اللہ پاک کے قابو میں ہیں، وہ جب چاہیں، جو چاہیں، جس کے ساتھ چاہیں، جیسا چاہیں کر سکتے ہیں، سب ان کے سامنے بالکل عاجز، بے بس، بے کس، مجبور، ذلیل اور حقیر ہیں۔ بس اس تصور کے ساتھ ڈرنا خوف کہلاتا ہے۔

اور خشیت کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے ڈرا جائے۔[3] لیکن بعض دفعہ خوف کہتے ہیں تو اُس سے خشیت مراد ہوتی ہے اور کبھی خشیت کہتے ہیں تو اس سے خوف مراد ہوتا ہے۔

۱: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/۱۷۶۔ ۲: فاطر: ۲۸۔ ۳: تفسیرِ رازی: جزء: ۲۹/ ۳۷۲۔

خشیت کا درجہ خوف سے بڑھ کر:

امامِ رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خوف پر یہ بشارت ہے تو پھر خشیت کا کیا حال ہو گا؟ کیونکہ خوف کا درجہ خشیت سے کم ہوتا ہے، اور خشیت کا درجہ بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے خوف کے وقت مقام کا ذکر ہے اور خشیت کے وقت اللہ پاک کے اسم مبارک کا ذکر ہے، کیونکہ خوف خشیت کے مقابلے میں چھوٹے درجے کی چیز ہے۔ خوف میں آدمی اپنی ذلت، حقارت، اور عاجزی کا احساس کر کے ڈرتا ہے۔ اور خشیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت کا استحضار کر کے ڈرتا ہے۔

اسی وجہ سے اگر خائف آدمی کو یہ بتایا جائے کہ تجھے عذاب یا سزا نہیں دی جائے گی تو اس کے گناہوں میں پڑنے کا امکان ہے، کیونکہ خوف کی حقیقت یہ ہے کہ طبیعت کسی ناگوار بات کے پیش آنے کا اندیشہ کر کے رُک جائے، بس وہ صرف اپنے پٹنے کے ڈر سے معاصی اور گناہوں سے بچ رہا تھا، اب چونکہ سزا نہیں ہے تو پھر اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا امکان ہے، اگر صاحبِ خشیت سے کہا جائے کہ ہم تم سے کوئی حساب نہیں لیں گے تب بھی وہ گناہ نہیں کرے گا، بلکہ اس کی خشیت اور بڑھ جائے گی۔ کیونکہ اس کے سامنے اللہ کی عظمت اور بڑائی ہے۔[1]

خوفِ الٰہی ہر حکمت کی اصل ہے:

اسی وجہ سے ایک حدیث میں ہے "خَشْیَۃُ اللّٰہِ رَأْسُ کُلِّ حِکْمَۃٍ"[2]

اللہ کی خشیت ہر حکمت کی اصل اور جڑ ہے۔

---

[1]: تفسیرِ رازی: جزء:۲۹/ ۳۷۲۔ [2]: کنز العمال: الکتاب الثالث فی الأخلاق، الباب الأول: فی الأخلاق والأفعال المحمودۃ، ۵۸۷۲۔

یہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے حضور پاک ﷺ پر تسلی کا مضمون اُترتا ویسے ویسے آپ (ﷺ) کی خشیت بڑھتی جاتی تھی۔ آپ نماز میں کھڑے ہوتے اور پوری پوری رات نماز میں گزار دیتے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم عرض کرتے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کیوں اتنی مشقت اُٹھاتے ہیں؟ تو آپ یوں فرماتے:

"أَفَلَا أَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا"[۱] "کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں"

خشیت میں یہ ہوتا ہے کہ جتنی تسلی ہوتی ہے اتنی ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ خشیت والے:

اسی واسطے حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"وَاللهِ اِنِّیْ لَاَتْقَاکُمْ لِلّٰهِ وَاَخْشَاکُمْ لَهٗ" اللہ کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے خشیت رکھنے والا ہوں۔[۲] چونکہ اللہ پاک کی عظمت کو حضور ﷺ ہی زیادہ پہچانتے تھے، اس لئے آپ میں سب سے زیادہ خوف اور سب سے زیادہ خشیت تھی۔

خشیت الٰہی سے مکھی کے سر کے برابر بھی آنسو نکلنے پر جہنم حرام:

ایک حدیث میں ہے:

"مَا مِنْ عَبْدٍ مُّؤْمِنٍ يَّخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دُمُوْعٌ وَإِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ... إِلَّا حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ"[۳]

"کوئی مومن بندہ جس کی آنکھوں سے اللہ کی خشیت اور خوف کی وجہ سے آنسو نکل جائیں، اگرچہ کہ مکھی کے سر کے برابر ہو مگر یہ کہ اللہ پاک اس پر آگ حرام کر دیتے ہیں"۔

۱: صحیح بخاری: ابواب التہجد / باب قیام النبی حتی ترم قدماہ۔ ۲: صحیح مسلم: کتاب الصیام / باب بیان ان القبلۃ فی الصوم لیست محرمۃ الخ۔ ۳: سنن ابن ماجہ: کتاب الزھد، ۴۱۸۷۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا خوف:

اس معاملے میں حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی حال تھا کہ جب نماز کے لیے آتے تو ان کی کیفیت متغیر ہو جاتی، وہ کانپتے اور ڈرتے تھے۔ امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب مسجد میں نماز کے لیے آتے تو مسجد تک پہنچنے میں اللہ کی خشیت کی وجہ سے وہ زرد پڑ جاتے تھے۔ یہی حال صحابہؓ کرام کا بھی تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر کل قیامت میں یہ اعلان ہو جائے کہ کوئی جہنم میں نہیں جائے گا سوائے ایک آدمی کے تو مجھے اندیشہ ہے کہ شاید وہ ایک آدمی میں ہی ہوں۔

پیغمبروں پر جلالِ الٰہی کا اثر:

کل قیامت میں پیغمبروں پر اللہ کا ایسا خوف طاری ہو گا کہ امتیں پیغمبروں سے حساب و کتاب شروع کرنے کی سفارش کرنے کے لئے کہیں گی تو وہ معذوری ظاہر کریں گے، اور کہیں گے کہ ہم سے دنیا میں یہ خطا ہوئی تھی، اگر آج ہم سے اس کا سوال ہو گا تو ہم کیا جواب دیں گے؟ وہ اللہ کے نبی ہیں، اللہ پاک کے محبوب اور مقرب بندے ہیں، لیکن اللہ کا خوف ان پر طاری ہے، اس لئے سوال کی ہمت نہیں کر پائیں گے۔ اخیر میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سفارش کریں گے تو پھر مخلوق کا حساب و کتاب شروع ہو گا۔

خوفِ خدا رکھنے والے ایک نوجوان کا واقعہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک نوجوان اکثر مسجد میں عبادت میں مشغول رہا کرتا تھا۔ بہت زیادہ متقی اور پرہیز گار تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس کو پسند فرماتے تھے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ حضرت عمر جیسی شخصیت جس کو پسند کرتی ہو وہ کیسا ہو گا؟ اس کا انتقال ہوا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ چلو اس کی تعزیت کر کے

آتے ہیں، جب یہ لوگ گھر پہنچے تو دیکھا کہ باپ بہت مغموم ہے، اُس کو تسلی دی اور افسوس کا اظہار کیا، اُس کے بعد پوچھا کہ انتقال کیسے ہوا؟ وہ تو بہت تندرست تھا، اُس کے والد نے کہا کہ عشاء کی نماز کے بعد گھر واپسی میں کافی دیر ہوگئی تھی، (اور اس وقت عشاء کی نماز تاخیر ہی سے ادا کی جاتی تھی، اور حضور ﷺ بھی عشاء دیر سے ادا فرماتے تھے: "وَيُصَلِّى الْعِشَاءَ حِيْنَ يَسْوَدُّ الْأُفُقُ")[1] مسجد اور اس کے مکان کے مابین کئی مکانات تھے، اُن میں سے ایک مکان کی لڑکی اس کی جوانی اور تندرستی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوگئی، ظاہر ہے کہ ہر کسی کے ساتھ نفس لگا ہوا ہے اور یہ عشق مجازی بھی ایسی چیز ہے کہ آدمی اس میں اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے، اُس لڑکی نے اسے بلانا شروع کیا۔ اور یہ بہت بڑی آزمائش ہے کہ جب مرد اپنی طرف سے کسی عورت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرے اور پھر وہ راضی ہو جائے تو اس میں آدمی کا بچنا بڑا مشکل ہوتا ہے، چہ جائیکہ عورت بلائے اور اس کے مکر سے آدمی بچ جائے، بالخصوص جب کہ وہ خوبصورت ہو، عالی نسب ہو، اور خود پہل کرے اور وہ بھی رات کے اندھیرے میں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عورتیں تو شیطان کا جال ہوتی ہیں۔ بہر حال اُس لڑکی نے نوجوان کو مائل کرنا شروع کیا، لیکن اُس نے کئی دفعہ انکار کر دیا، اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا اور وہ مسلسل اصرار کرتی رہی۔ آخر ایک مرتبہ اُس نے گناہ کا ارادہ کر لیا اور جیسے ہی دروازے پر پہنچا تو بے ہوش ہو کر گر گیا۔ لڑکی بڑی پریشان ہوگئی، اس نے گھر والوں کو بتایا کہ یہ لڑکا یہاں سے گزر رہا تھا کہ اچانک بے ہوش ہو گیا، ان لوگوں نے اسے اُٹھوا کر اس کے گھر پہنچا دیا، باپ نے پوچھا کہ اسے کیا ہوا؟ اُنھوں نے بتایا کہ یہ راستے میں ہمارے گھر کے سامنے بے ہوش ہو گیا تھا، ہم نے سوچا کہ اسے اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ہم اس

---

[1]: سنن ابو داؤد: کتاب الصلاۃ/ باب فی المواقیت۔

کو لے کر یہاں آئے ہیں، اس کے بعد اسے ہوش میں لایا گیا۔ باپ نے پوچھا کہ بیٹا! کیا ہوا تھا؟ بیٹے نے کہا کہ ابا جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ باپ نے کہا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نوجوان اور تندرست آدمی اچانک بے ہوش ہو جائے؟ یقیناً کوئی تو بات ہے۔ اُس نوجوان نے اپنے باپ کو پورا قصہ سنا دیا، اور کہا کہ اس موقع پر مجھے ایک آیت یاد آگئی اور اس آیت کا اثر میرے قلب پر اتنا ہوا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ باپ نے پوچھا کہ بیٹا! وہ کون سی آیت تھی؟ (باپ کا یہی پوچھنا غضب ہو گیا) بیٹے نے کہا کہ ابا جان! وہ یہ آیت تھی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ﴾[1]

"یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ چونک جاتے ہیں پھر یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں"۔

اُس کو جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ہوا تو وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کو سنا تو بہت متأثر ہوئے اور بہت روئے اور کہا کہ تم نے مجھے بلایا کیوں نہیں؟ اس زمانے میں تکلفات نہیں تھے۔ جب بھی کسی کی شادی یا انتقال ہوتا تھا تو فوراً ہی اُس کو نمٹا دیا جاتا تھا، تمام لوگوں کو بتانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ اور پھر امیر المؤمنین کو ایک ایک آدمی کے جنازے کے لیے اور دیگر چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے بلایا جائے تو اس میں بھی کافی حرج ہوتا ہے، اس لئے ان لوگوں نے کہا کہ آپ امیر المؤمنین ہیں، آپ کے ساتھ خلافت کے اُمور لگے ہوئے ہیں، ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ کو تکلیف دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ چلو اس کی قبر پر چلتے ہیں۔ وہ قبر پر تشریف لے گئے اور اُس کے لیے دعا کی اور پھر اس کے بعد یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ﴾

---

[1] الاعراف: ۲۰۱۔

”جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے گا تو اُس کے لیے دو جنتیں ہیں“، قبر سے آواز آئی: ”قَدْ أَعْطَانِيْهِمَا رَبِّيْ يَا عُمَرُ!“

اے عمر! میرے پروردگار نے مجھے اُن دو جنتوں سے نواز دیا ہے۔[1]

خوف اور خشیت کیسے پیدا کی جائے؟

یہ صفت ہمیں اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جب آدمی کے دل میں گناہ کا داعیہ پیدا ہو، اور پھر گناہ ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں خوف نہیں ہے۔ جب خوف نہیں ہے تو پھر اسے پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اللہ پاک کی عظمت اور کبریائی کو سوچے، اور خوف کے مضامین کو یاد کرے، اور اس کی سزاؤں کا استحضار کرے تو پھر خوف اور خشیت پیدا ہو گی۔

جنتیں کیسی ہوں گی؟

”جنتان“ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک جنت سونے کی اور ایک جنت چاندی کی ہو گی۔[2] دنیا میں باغات اور درخت لکڑی کے ہوتے ہیں، لیکن جنت میں وہ سونے اور چاندی کے ہوں گے۔ ان جنتوں میں سونے اور چاندی کے سامان ہوں گے، یہاں مٹی اور لکڑی سے پھل نکلتے ہیں تو وہاں سونے اور چاندی سے نکلیں گے۔

بعض روایات میں ہے کہ دو جنتیں سونے کی ہوں گی، اور اس کے برتن وغیرہ سب سونے کے ہوں گے، اور دو جنتیں چاندی کی ہوں گی اور اس کے برتن وغیرہ سب چاندی کے ہوں گے، ان کے درمیان اور رب کے دیدار کے درمیان سوائے کبریائی کی چادر کے اور کچھ نہیں ہو گا۔[3]

۱: تاریخ دمشق لابن عساکر: ۴۵/۴۵۰۔ ۲: تفسیر ابن کثیر: ۷/۵۰۱۔ ۳: تفسیر مظہری: ۹/۱۵۷۔

دو جنتیں کیوں؟

یہ دو جنتیں انسان کو کیوں دی جائیں گی؟ علماء نے لکھا ہے کہ ایک تو مامورات پر عمل کرنے کی وجہ سے اور دوسری منکرات سے بچنے کی وجہ سے۔[۱]

ترکِ گناہ پر بھی ثواب ہے:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ گناہ سے بچنا بھی ثواب ہے۔ اور اپنی بیوی کے پاس جاکر خواہش پوری کرنا بھی باعثِ ثواب ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! آدمی تو لذت حاصل کرنے کے لیے خواہش پوری کرتا ہے اس میں ثواب کیوں ملے گا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ ناجائز جگہ اپنی خواہش پوری کرے تو اس کو گناہ ہوگا یا نہیں؟ صحابہ نے کہا کہ جی ہاں! اُس کو گناہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسے ہی جب وہ اپنی خواہش جائز محل میں پوری کرے گا تو اسے ثواب بھی ملے گا۔ (کیونکہ وہ برائی سے بچ رہا ہے)[۲]

اس سے پتہ چلا کہ مامورات پر عمل کرنے کا بھی ثواب ہے، اور منکرات سے بچنے کا بھی ثواب ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ دو جنتوں میں سے ایک جنت جنات کیلئے اور ایک جنت انسانوں کیلئے ہوگی۔ چونکہ خطاب دونوں سے ہے، اس لئے جنت بھی دونوں کے لئے ہوگی۔[۳] اور بعض نے کہا ہے کہ انسان اور جنات میں سے ہر ڈرنے والے کے لئے دو دو جنتیں ملیں گی۔[۴]

جسم و روح کے لئے علٰحدہ جنت:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے دو جنتیں عطا فرمانے کی ایک اور وجہ لکھی ہے، فرمایا کہ ایک جنت جسم کے لیے دیں گے اور ایک جنت روح کے لئے دیں گے۔[۵] جسمانی لذت کے

۱: تفسیر رازی: ۱۵/۱۰۰۔ ۲: صحیح مسلم: کتاب الزکاۃ/باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف۔ ۳: تفسیر رازی: ۱۵/۱۰۰۔ ۴: تفسیرِ مظہری: ۹/۱۵۷۔ ۵: تفسیر رازی: ۱۵/۱۰۰۔

لیے ایک جنت ہو گی اور روحانی لذت کے لئے ایک جنت ہو گی، کیونکہ روح کا ذوق الگ ہے، اُس کی قوت الگ ہے، اُس کا کیف اور اس کے احساسات الگ ہیں، اس اعتبار سے اس کے لئے ایک جنت ہو گی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ایک جنت عمل کے بدلے ملے گی اور ایک جنت فضل کے طور پر ملے گی۔ بعض نے لکھا ہے کہ ایک جنت عقائد کے سبب ملے گی، اور ایک جنت اعمال کے سبب ملے گی۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک جنت رب سے ڈرنے کی وجہ سے ملے گی اور ایک شہوات پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ملے گی۔[۱]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک جنت تو اس کی منزل اور محل ہو گا، جسے دیکھنے کے لئے لوگ آئیں گے، اور ایک جنت اس کی بیوی اور خادموں کے لئے ہو گی۔[۲]

آگے فرماتے ہیں:

باغوں اور درختوں کی کیفیات:

ذَوَاتَآ أَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۴۹﴾

”اور وہ) دونوں (باغ) کثیر شاخوں والے ہوں گے۔ سواے جن و انس! تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟“

دونوں جنتیں بہت زیادہ شاخوں والی ہوں گی، جس کا سایہ بھی کافی گھنا ہو گا اور پھل بھی زیادہ ہوں گے۔[۳]

عجیب بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اُن کے پیڑ بہت ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ پیڑ آدمی کو آنے جانے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ اس کی شاخیں زیادہ ہوں گی۔ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ وہ بغیر پیڑ کے

۱: تفسیرِ مظہری:۹/۱۵۷۔ ۲: روح المعانی:۱۴/۱۱۵۔ ۳: تفسیرِ مظہری:۹/۱۵۷۔

باغ ہوں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ اُن کے تنے تو پتلے ہوں گے لیکن اُن کی شاخیں بڑی گنجان اور پھیلی ہوئی ہوں گی۔[۱] ایک ایک درخت سینکڑوں اور ہزاروں میل پھیلا ہوا ہوگا، سارا کا سارا پھلدار ہوگا اور پھر وہ سونے کا ہوگا۔

ایک درخت اتنا بڑا ہوگا کہ اگر ایک سوار سو سال تک اس کے سایہ میں چلے گا تب بھی اس کا سایہ ختم نہ ہوگا۔[۲]

ابن عباس رضی اللہ عنہما "ذَوَاتَا اَفْنَانٍ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ وہ دونوں باغ ایسے ہوں گے جس میں مختلف رنگ کے پھل ہوں گے۔[۳]

جنتی چشموں کی صفات:

فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيَانِ ﴿۵۰﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۵۱﴾

ان دونوں (باغوں) میں دو چشمے ہونگے کہ بہتے چلے جاوینگے۔ سوائے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

چشموں کا بہاؤ اہلِ جنت کے تابع ہوگا:

تفسیرِ مظہری میں لکھا ہے کہ یہ دونوں چشمے بلندی یا نشیب میں جدھر جنتی چاہیں گے بہیں گے۔ نیز یہ چشمے دو نہیں ہوں گے جیسا کہ بظاہر محسوس ہوتا ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دو قسم کے چشمے ہوں گے۔

جنت کی چار نہریں:

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جنت میں چار نہریں ہوں گی۔ (۱) زنجبیل۔ (۲) سلسبیل۔ (۳) تسنیم۔ (۴) اور ایک وہ جس کا "يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا" میں ذکر ہے۔[۴]

---

[۱]: تفسیر رازی: ۲۹/۳۷۴۔ [۲]: سنن ترمذی: ابواب صفۃ الجنۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باب ماجاء فی صفۃ شجر الجنۃ۔ [۳]: تفسیرِ مظہری: ۹/۱۵۷۔ [۴]: تفسیرِ مظہری: ۹/۱۵۸۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ جو آدمی دنیا میں خدا کے خوف سے آنسو بہاتا ہے تو کل یہ آنسو گویا ان نہروں کی صورت میں متشکل ہوں گے۔[۱]

ان کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہو گا۔ اُس میں ستاروں کی طرح آبخورے ہوں گے۔

چشموں کے کنکر یاقوت اور زمرد کے اور مٹی مشک کی ہو گی

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جنت کے چشمے دنیا سے کہیں زیادہ بڑے ہوں گے، اُس کے کنکر سرخ یاقوت اور سبز زمرد کی طرح ہوں گے، اور اس کی مٹی کافور کی ہو گی، اور ان کا کیچڑ مشک اذفر کا ہو گا، اور ان کے دونوں جانب زعفران ہو گا۔[۲]

قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے ان چشموں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ، وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾[۳]

”جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اسکی کیفیت یہ ہے کہ اسمیں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہیں ہو گا۔ اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہو گا اور بہت سی نہریں شراب کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی اور بہت سی نہریں ایسے شہد کی ہیں جو بالکل صاف ہو گا“

اللہ تبارک وتعالیٰ یہ سب چیزیں کیوں بیان کر رہے ہیں؟ انہیں معلوم ہے کہ ہم کس چیز کے عاشق ہیں۔ ہمارے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک خواہش رکھی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے گھر کے پیچھے ایک چھوٹا سا تالاب بن جائے، اُس میں دو چار بطخیں ہوں، ساتھ

۱: تفسیر حقانی: ۱۴/ ۷۹/ ۴۔ ۲: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/ ۱۷۹۔ ۳: سورہ محمد: ۱۵۔

میں کچھ چمن بندی بھی ہو جائے، مکان کی بھی کچھ زینت ہو جائے، ان چاہتوں کا اللہ پاک کو علم ہے، یہ چاہت بھی اللہ تبارک وتعالیٰ ہی نے بنائی ہے، ان سب کا ذکر کر کے اللہ پاک بندے کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ بس تو دنیا میں میری مرضی اور میرے حکم پر چل، آخرت میں تیری مرضی اور تیری خواہش چلے گی۔

پھلوں کی اقسام:

آگے ان دو باغوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فِيهِمَا مِن كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ﴿۵۲﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۵۳﴾

ان دونوں (باغوں) میں ہر میوے کی دو دو قسمیں ہوں گی۔ سوائے جن و انس! تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

باغ اور چشموں کے درمیان نہروں کے ذکر کی وجہ:

جنتوں کے ذکر کے بعد پھلوں کا ذکر زیادہ مناسب تھا، نہ کہ درمیان میں چشموں کا ذکر، اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی جب بہترین باغ میں داخل ہوتا ہے تو پہلے کھانے کی طرف سبقت نہیں کرتا ہے، بلکہ وہاں کچھ دیر تفریح کرتا ہے، وہاں کے ماحول سے کچھ دیر لطف اندوز ہوتا ہے، اور کچھ موج و مستی میں مشغول ہوتا ہے، پھر جب بھوک محسوس ہوتی ہے تو کھانے کی طرف مائل ہوتا ہے، اس لئے اللہ پاک نے درمیان میں چشموں کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد پھلوں کا ذکر فرمایا۔

ان دو باغوں میں پھلوں کی ہر قسم ہوگی۔ اور ہر پھل دو قسم کا ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدمی کے مزاج میں کچھ ایسی بات رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کی طبیعت ایک چیز سے جلد ہی بھر جاتی ہے، اور دوسری کا تقاضہ ہونے لگتا ہے، ایک گاڑی لے لی تو چند دن کے بعد دوسری گاڑی کی فکر ہوتی ہے۔ ایک مکان لے لیا تو دوسرے کی فکر ہونے لگتی ہے۔ ایسے ہی اس کے پاس جوتے یا کپڑے ہوں تو وہ ایک پر قناعت نہیں

کرتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی فیاضی میں بھی ایسا رکھا ہے کہ آدمی کو آنکھیں دو دی ہیں، کان دو دیے ہیں، ہاتھ دو دیے ہیں، گُردے دو دیے ہیں حالانکہ لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک سے بھی کام چل جاتا ہے۔ لیکن دل دیا ہے تو ایک ہی دیا ہے، اس کی بھی ایک مصلحت ہے، اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ دل ایک ہی کے لیے ہے اس میں کسی اور کی گنجائش نہیں، زبان ایک دی ہے، اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس سے ایک ہی ذات کو یاد کیا جاسکتا ہے، کسی اور کو نہیں۔

پھلوں کے ذائقے

جنت کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ وہاں کسی چیز سے دل بھر جائے، چونکہ یہ مزاج ہے اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ ہر قسم کے پھل ہوں گے، اور ہر پھل دو دو قسم کے ہوں گے۔ علماء نے لکھا ہے کہ ہر پھل میں دو ذائقے ہوں گے۔ ایک ہی پھل میں دو مزے ہوں گے، پھل کا ایک حصہ کھا رہے ہیں تو الگ مزہ آئے گا، اور دوسرا حصہ کھا رہے ہیں تو الگ مزہ آئے گا۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک پھل کا جو مزہ آئے گا دوبارہ وہ مزہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اِلّا یہ کہ وہ خود ہی اُس ذائقے کو دوبارہ کھانا چاہے۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی کو تکرار نہیں ہے، اُن کے خزانے محدود نہیں ہیں کہ ذائقوں کو دوبارہ دہرانے کی ضرورت پڑے۔

بعض نے کہا کہ دو جنتوں میں سے ہر جنت میں ہر پھل متعدد ہو گا۔ یا ہر پھل کی دو قسمیں ہوں گی۔[1]

---

[1] تفسیر رازی: ۲۹/ ۳۷۶۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ پھلوں کے دو قسم کے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ایک قسم وہ ہوگی جو نادر ہوگی دنیا میں کوئی اس سے واقف نہ ہوگا، اور ایک قسم وہ ہوگی جو لوگوں میں معروف ہوگی۔[۱]

بعض علماء نے کہا ہے کہ پھلوں کی ایک قسم خشک ہوگی اور ایک تر ہوگی۔[۲]

ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر پھل چاہے میٹھا ہو یا کڑوا وہ جنت میں ہوگا، مگر یہ کہ کڑوے کو بھی میٹھا کر دیا جائے گا۔[۳]

جنت اور دنیا کے پھلوں میں صرف نام کا اشتراک:

ایک اور روایت انہیں سے ہے: "لَيْسَ فِي الدُّنْيَا مِمَّا فِي الْجَنَّةِ إِلَّا الْأَسْمَاءُ"[۴]

جنت کی چیزوں کے دنیا میں بس نام ہیں۔ نام کے سوا اور کچھ نہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

اسی کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دنیا اور آخرت کے پھلوں میں صرف نام مشترک ہے ورنہ جنت کے پھلوں کی کیفیت، لذت، حقیقت اور مقدار بالکل الگ ہوگی۔ کیونکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کی نعمتوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسی ہیں جن کے بارے میں کسی کان نے نہ سنا ہوگا، نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا، اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا ہوگا۔[۵]

وہاں آدمی کو نہ تکان ہے، نہ عجز ہے، نہ بھوک ہے، نہ پیاس ہے، نہ نیند ہے، کسی طرح کی کوئی حرکت نہیں، بس آرام ہی آرام ہے، دنیا میں آدمی متحرک ہوتا ہے اور

۱: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/۱۷۹۔ ۲: حوالۂ سابق۔ ۳: حوالۂ سابق۔ ۴: تفسیر مظہری: ۱۵۸/۹۔

۵: صحیح بخاری: باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ۔ ۳۲۲۴۔

اُس کا مطلوب ساکن ہوتا ہے۔ اس کو چیز لینے کے لیے خود جانا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو پھل لینا ہے تو آپ دوکان جاکر پھل خریدیں گے، لیکن جنت میں کیا ہوگا؟ تو فرمایا: ﴿قُطُوۡفُهَا دَانِيَةٌ﴾ جنت کے پھل خود کھانے والے کے قریب ہونگے۔

جنت کے فرش کا استر:

"مُتَّكِئِيۡنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَآئِنُهَا مِنۡ اِسۡتَبۡرَقٍ‌ؕ وَجَنَى الۡجَـنَّتَيۡنِ دَانٍ‏ ﴿۵۴﴾ فَبِاَىِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ‏ ﴿۵۵﴾

"وہ لوگ تکیہ لگائے ایسے فرشوں پر بیٹھے ہونگے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے۔ اور ان دونوں (باغوں) کا پھل بہت نزدیک ہوگا۔ سوائے جن و انس! تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

"استبرق" دبیز ریشمی مخمل کو کہتے ہیں۔ اور "اَلْجَنٰی" درختوں سے منتخب اور توڑے جانے والے پھل کو کہتے ہیں۔

ظاہر فرش کیوں مخفی رکھا گیا؟

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے استر کے بارے میں بتایا کہ وہ دبیز ریشم کا ہوگا، لیکن ابرے (ظاہری حصہ) کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، کیونکہ روئے زمین پر کوئی اس سے واقف نہیں ہے۔[۱]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اہلِ دنیا باطن کو چھوڑ کر ظاہر سنوارتے ہیں، اور ظاہر کی زینت دکھانا چاہتے ہیں، اللہ پاک نے باطن کے بارے میں بتلا دیا کہ اس کی یہ کیفیت ہوگی، اور ظاہر کو مخفی رکھا، تاکہ وہ خود غور کریں کہ جب فرش کا باطن اور استر ایسا ہوگا تو اس کا ظاہر کیسا ہوگا؟[۲]

۱: تفسیرِ مظہری:۹/۱۵۸۔ ۲: تفسیرِ رازی:۲۹/۳۷۷۔

جنت کے فرش کا ظاہر:

مفسرین نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اس کا ظاہر مجسم نور کا ہو گا۔[۱]

پھل اہلِ جنت کے پاس خود آئیں گے:

جنتی ایسے فرشوں پر ٹیک لگائے ہوں گے، اور جنت کے پھل ان کے منہ کے قریب آجائیں گے، اور وہ لیٹے لیٹے، بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے جس طرح چاہیں گے ان کو کھائیں گے۔[۲]

جنت میں انسان ساکن اور نعمتیں متحرک ہوں گی:

حدیث میں آتا ہے کہ آدمی جب پھل دیکھے گا اور اُس کو کھانے کی خواہش ہو گی تو پھل اُس کے پاس آجائے گا۔ لیکن دنیا میں آدمی کو پھل خریدنے کے لئے جانا پڑتا ہے، یا آدمی پھل توڑتا ہے تو ایک پھل اس سے قریب ہوتا ہے اور دوسرا دور ہوتا ہے۔ لیکن جنت میں انسان کو کسی حرکت کی ضرورت ہی نہیں ہو گی، وہاں آدمی ساکن ہو گا اور جنت کی نعمتیں متحرک ہوں گی، کسی ضرورت کے لئے آدمی حرکت نہیں کرے گا، ساری چیزیں خود اس کے پاس آجائیں گی، اور آدمی کا ساکن ہونا تھکنے کی وجہ سے نہیں ہو گا بلکہ عیش و عشرت کی وجہ سے ہو گا۔[۳]

اڑتا ہوا پرندہ خوان بن کر حاضر ہو جائے گا:

آدمی کو پرندہ کھانے کی خواہش ہو گی تو کسی شکار کی ضرورت نہیں ہو گی، بلکہ وہی پرندہ بھنا ہوا اس کے پاس آجائے گا، اور جب آدمی اس کو کھالے گا تو پھر وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اُڑ جائے گا۔ پرندہ کھانے کا جو مزہ ہے وہ تو اپنی جگہ ہے، لیکن جب وہ دوبارہ زندہ ہو کر اُڑے گا تو اس کا مزہ الگ ہو گا۔

۱: حوالۂ سابق۔ ۲: روح المعانی: ۱۴/۱۷۷۔ ۳: تفسیرِ رازی: ۲۹/۳۷۷۔

حوروں کی صفات:

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾

ان میں نیچی نگاہ والیاں (یعنی حوریں) ہوں گی کہ ان (جنتی) لوگوں سے پہلے ان پر نہ توکسی آدمی نے تصرف کیاہو گا اور نہ کسی جن نے۔ سوائے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

یہ آدمی کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایسی لڑکی کو چاہتا ہے جس کا اس سے پہلے کسی اور سے تعلق نہ ہوا ہو۔ اور یہ بات بالکل معقول اور غیرت والی ہے۔ پرانے زمانے میں اس بات پر جنگیں ہوا کرتی تھیں، اور پھر یہ صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ کافر اور یہودیوں میں بھی فطرتاً یہ بات پائی جاتی ہے۔

اس لئے فرمایا کہ وہاں نگاہوں کو نیچے رکھنے والی عفیف حوریں ہوں گی، اپنی ذات میں بھی وہ خود اتنی پاک دامن ہوں گی کہ وہ کبھی نگاہ ہی نہیں اُٹھائی ہوں گی، وہ صرف اپنے شوہروں کو دیکھیں گی، کسی اور کو نہیں۔

نہ کسی انسان نے اُسے ہاتھ لگایاہو گا اور نہ کسی جن نے۔ اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ کیوں سنا رہے ہیں؟ اس لئے کہ بڑے بڑے زاہد، مشائخین، علماء، مفتیانِ کرام، ڈاکٹرس، انجینئرس، وکلاء، تجار، دیہاتی، شہری سب کے دلوں میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی بیوی میں یہ وصف ہو۔

ستر جوڑوں سے پنڈلی کا گودا نظر آئے:

اور پھر ان کی خوبصورتی کا عالم یہ ہو گا کہ وہ ستر جوڑے پہنی ہوئی ہوں گی، اور ان ستر جوڑوں سے کوئی بدصورتی اور بے ڈھنگا پن ظاہر نہیں ہو گا، بلکہ خوبصورتی میں اور اضافہ ہو گا، اور ان ستر جوڑوں کے اندر سے اس کی پنڈلی اور پنڈلی کا گودا نظر آئے گا۔[1]

---

[1]: صحیح مسلم: باب فی صفات الجنۃ واہلھا، ۲۸۳۴۔

حور کی جھلک سے عالم روشنی اور خوشبو سے بھر جائے:

اُن کی چمک کا یہ حال ہو گا کہ اگر وہ دنیا میں جھانکے تو سورج و چاند کی روشنی ان کے سامنے ماند پڑ جائے۔ ساری زمین مشک کی خوشبو سے بھر جائے۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ اگر وہ صرف اپنی ہتھیلی اہل دنیا پر ظاہر کرے تو آسمان اور زمین روشن ہو جائے۔ اور ان کی خوشبو کی مہک پانچ سو سال کی مسافت سے محسوس ہو۔[2]

حور کے لعاب سے سات سمندر میٹھے ہو جائیں:

اگر وہ اپنا لعاب سات سمندروں میں ڈال دے تو سارے سمندروں کا پانی میٹھا ہو جائے۔

"لَوْ اَنَّ حَوْرَاءَ بَصُقَتْ فِیْ سَبْعَۃِ اَبْحُرٍ لَعَذُبَتِ الْبِحَارُ مِنْ عَذُوْبَۃِ رِیْقِھَا"[3]

حور کے کنگن کی جھلک سے سورج بے نور ہو جائے:

اور اس حور کے کنگن کی دنیا میں صرف جھلک دکھادی جائے تو اُس کے سامنے سورج کی روشنی ایسی ماند پڑ جائے گی جیسے سورج کے نکلنے پر ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔[4]

سورج کے نکلنے پر جیسے ستارے نظر سے غائب ہو جاتے ہیں، ایسے ہی اگر جنتی عورت کے کنگن کی جھلک اس دنیا پر پڑ جائے تو سورج کی روشنی غائب ہو جائیگی اور وہ بے نور ہو جائیگا۔

کیا جنت میں استنجاء کی ضرورت ہو گی؟

ایک مرتبہ میں اسی طرح تقریر کر رہا تھا۔ دورانِ تقریر میں نے حوروں کے حسن و جمال کا ذکر کیا، اور اس میں اس بات کا بھی ذکر کیا کہ وہ اتنی حسین و جمیل ہوں گی کہ اُس کی ہڈیاں اور گُودا نظر آئے گا۔ بیان کے بعد ایک صاحب ملے اور کہنے لگے کہ جب

---

[1]: معجم الکبیر للطبرانی:۵۳۷۹۔ [2]: مصنف ابن ابی شیبہ:۳۳۹۸۷و۳۳۹۸۸۔ [3]: صفۃ الجنۃ لابی نعیم: ذکر نکاح اٗھلھا وتعانقھم حورھا،۴۱۰۔ [4]: سنن ترمذی: باب ماجاء فی صفۃ اھل الجنۃ۔

اُس کا گو داو غیرہ سب نظر آئے گا تو کیا مزہ آئے گا؟ طبیعت اس سے گھن نہیں کرے گی؟ میں نے کہا کہ حضور پاک ﷺ نے اس کا بھی جواب دیا اور فرمایا کہ:

”لَا یَبُوْلُوْنَ وَلَا یَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا یَمْتَخِطُوْنَ وَلَا یَتْفُلُوْنَ وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ“[۱]

”اہل جنت پیشاب نہیں کریں گے، پاخانہ نہیں کریں گے، تھوکیں گے نہیں، ناک کی ریزش صاف نہیں کریں گے، اور ان کا پسینہ مشک کا ہوگا“

ایک یہودی آپ ﷺ کے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ اے محمد! (ﷺ) کیا جنت میں بھی لوگ کھائیں گے اور پئیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ کیوں نہیں؟ بلکہ جنت میں ایک آدمی کو کھانے پینے اور جماع میں سو آدمیوں کے برابر قوت دی جائے گی، یہودی نے کہا کہ پھر تو اس کو استنجاء کی بھی حاجت ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ مشک کی طرح خوشبودار پسینہ آئے گا اور کھانا ہضم ہو جائے گا۔[۲]

اور ایک روایت میں آپ نے فرمایا: ”طَعَامُهُمْ ذَاكَ جُشَاءٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ“[۳]

ان کا کھانا مشک کی طرح ڈکار سے ہضم ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے: ”فَلَيْسَ فِيهِنَّ اَذًى“[۴] کہ ان کو پیریڈ (menses) نہیں ہوگا۔

پس جب ان میں کوئی گندگی نہیں ہوگی، خون، پیپ، پیشاب پاخانہ اور تھوک وغیرہ سے وہ پاک ہوں گے، ایک مُشک کی ڈکار آئے گی یا تھوڑا سا پسینہ آئے گا اور سب ہضم ہو جائے گا تو پھر ان سے گھن اور تکدر بھی نہیں ہوگا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ روح کی معراج دیدارِ الٰہی ہے اور جسم کی معراج عورت ہے، اس کے آگے اور کوئی لذت ہی نہیں ہے۔ اتنے بڑے بڑے

۱: صحیح بخاری: باب احادیث الانبیاء: ۳۳۲۷۔ ۲: مسند احمد: الجزء الثانی والثلاثون: ۱۹۲۶۹، ۱۹۔

۳: صحیح مسلم، باب فی صفات الجنۃ ۷۳۳۳۔ ۴: مسند الفردوس: ۲۹۵۵۔

باغات، محلات، خادم، ہر طرح کا آرام، چین، سکون، راحت، حتٰی کہ کسی ضرورت کے لئے کسی حرکت کی ضرورت ہی نہیں، تو اس سے بڑا کیا عیش ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ ان کے علاوہ تمہیں ایک اور عیش کی چیز دی جائے گی، جس سے اصل عیش حاصل ہو گا، اور وہ ہے جنت کی حوریں۔ آدمی ذرا سوچے کہ ایک باغ ہو اور اُس میں یہ ساری خرمستیاں اور عیاشیاں ہوں، لیکن حور نہ ہو تو کیا مزہ آئے گا؟

جنتی مردوں کی قوت:

اس لئے ایسی جب حوریں ہوں گی تو اللہ پاک اسی اعتبار سے ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے مرد میں بھی اسی طرح کی قوت پیدا کر دیں گے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جنتی مرد کو جماع میں سو مردوں کے برابر قوت ہو گی۔[۱]

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! (ﷺ) کیا اہل جنت بھی جماع کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! وہ ایسے ذکر سے جماع کریں گے کہ جو کبھی سست نہیں پڑے گا اور کبھی اس کی خواہش کم نہیں ہو گی۔[۲]

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں آدمی سو سو عورتوں سے صحبت کر سکے گا۔[۳]

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ جنت میں آدمی جتنا چاہے جماع کر سکے گا، اور جیسے جیسے وہ عورتوں کو دیکھے گا ویسے ویسے نئی نئی شہوت پیدا ہوتی جائے گی۔ اور ایک مرتبہ جماع کرنے کے بعد عورت دوبارہ باکرہ ہو جائے گی۔[۴]

کیا جنت میں بچے پیدا ہوں گے؟

اور پھر ایک کمال کی بات یہ ہے کہ جماع سے حمل نہیں ٹھہرے گا، ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

۱: مسند احمد: الجزء الثانی والثلاثون: ۱۹/ ۱۹۲۶۹۔ ۲: المعجم الکبیر: ۷/ ۷۵۷۳، ۷۶۷۴۔ ۳: در منثور: ۱/ ۱۰۰۔ ۴: حوالہ سابق۔

”اَهْلُ الْجَنَّةِ يَنْكِحُوْنَ النِّسَاءَ وَلَا يَلِدْنَ لَيْسَ فِيْهَا مَنِيٌّ وَلَا مَنِيَّةٌ“[۱]

”اہلِ جنت عورتوں سے صحبت کریں گے، لیکن عورتیں بچے نہیں جنیں گی، اس میں کوئی منی نہیں ہو گی۔ ایک روایت میں ہے کہ جنت میں اگر آدمی بچے چاہے گا تو ایک لمحے میں بچہ پیدا ہو جائے گا لیکن آپ نے فرمایا کہ وہاں لوگ اس کی خواہش نہیں کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسانوں کو ملنے والی حوریں ایسی ہوں گی جن کو کسی انسان نے کبھی ہاتھ نہ لگایا ہو گا اور نہ جماع کیا ہو گا، اور جنات کو ملنے والی حوریں ایسی ہوں گی جن کو کبھی کسی جن نے کبھی ہاتھ نہ لگایا ہو گا اور نہ جماع کیا ہو گا۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ دنیا میں بعض مرتبہ خود انسانوں کو جنات ستاتے ہیں اور ان پر مسلط ہو جاتے ہیں، تو جنت میں اس طرح کا بھی کوئی امکان نہیں ہو گا۔

وہ یاقوت اور مرجان کی طرح ہوں گی:

كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۵۹﴾

گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں۔ سو (اے جن و انس) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

یاقوت سفید قیمتی پتھر کو کہتے ہیں جو سرخ، نیلا اور زرد بھی ہوتا ہے۔[۲] اور مرجان کی تفسیر اس سے قبل گزر چکی ہے۔

یاقوت اور مرجان سے اُن کی صفائی، اُن کی چمک دمک، ان کی سفیدی و سرخی اور ان کے حسن کو بتانا مقصود ہے۔[۳] بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ رنگ میں صفائی نہیں ہوتی لیکن اعضاء برابر اور متناسب ہوتے ہیں۔ آنکھ جیسی ہونی چاہیے ویسی ہی ہے، ناک جیسی ہونی چاہیے ویسی ہی ہے، ہونٹ جیسے ہونے چاہیے ویسے ہی ہیں، لیکن اس میں

۱: الدر المنثور: ۱/ ۱۰۰۔ ۲: القاموس الوحید: ۱۹۱۵۔ ۳: تفسیرِ رازی: ۲۹/ ۳۷۹۔ وروح المعانی۔

ملاحت، ملایمت اور چکنا پن نہیں ہے تو وہ اٹریکشن (Atraction) کے لیے کافی نہیں ہوتا، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ وہ یاقوت اور مرجان کی طرح صاف ہوں گی، ستر جوڑوں کے پہننے کے باوجود اس کی پنڈلی کا گودا نظر آئے گا۔

بعض علماء نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جیسے موتی سیپی میں صاف اور شفاف ہوتی ہے، کسی آدمی کا ہاتھ اس کو چھوتا نہیں اسی طرح یہ بھی صاف وشفاف ہوں گی، ان کو کسی نے چھوا بھی نہ ہو گا۔[۱]

بعض علماء نے کہا ہے کہ ان کو یاقوت سے تشبیہ دی گئی ہے چہرے کی سفیدی اور چمک میں اور مرجان سے تشبیہ دی گئی ہے چہرے کی سرخی میں۔ اور بعض نے اس کے برعکس بھی کہا ہے۔[۲]

احسان کی تفسیر:

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۶۱﴾

بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز عنایت کے اور بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ سو (اے جن و انس) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

احسان کے ایک معنیٰ ہیں نیک کام کرنا، اور ایک ہے کام عمدگی اور اچھے طریقے سے کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جو آدمی دنیا میں نیک کام کرے گا، اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق کرے گا تو آخرت میں اس کے لئے یہ حور و قصور ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ جو آدمی دنیا میں "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو اس کا بدلہ سوائے جنت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟[۳]

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ پاک کیا کہہ رہے ہیں؟ صحابہ نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں،

۱: تفسیرِ رازی: ۲۹/ ۳۷۹۔ ۲: تفسیرِ مظہری: ۹/ ۱۵۹۔ ۳: تفسیرِ مظہری: ۹/ ۱۶۰۔

آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جس کو توحید کی نعمت میں نے دی ہے، اور اس کو میری معرفت ہوگئی تو اس کا بدلہ سوائے جنت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔[۱]

ایک اور روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ میں اسے اپنی جنت میں ٹھہراؤں گا اور اسے رحمت کی چادر سے ڈھانک لوں گا۔[۲]

دنیا میں کوالٹی ہے تو دین میں کیوں نہیں؟

یہ سب اس وقت ہے جب کہ آدمی کے اعمال میں عمدگی ہو، کوالٹی(Quality) ہو۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ انسان دنیا کی ساری چیزوں میں کوالٹی قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ اعمال میں کوالٹی کی فکر نہیں ہوتی۔ مثلاً نماز سب سے اہم اور سب سے پہلا فریضہ ہے، اسی اعتبار سے اس کو ادا کرنا چاہیئے، اس کے فرائض، واجبات، سنن مستحبات، آداب، مکروہات اور مفسدات سب کی رعایت کرنی چاہیے، خشوع اور خضوع سے اسے ادا کرنا چاہیئے۔ ایک ایک رکن میں ان چیزوں کی رعایت کرنی چاہیئے، لیکن ہم اپنا حال دیکھیں کہ ہم کیسی نماز ادا کرتے ہیں؟ نہ ہمیں فرائض کا علم ہے، نہ واجبات کا، نہ سنن کا، نہ مستحبات کا، نہ مکروہات کا اور نہ مفسدات کا، اور ہمیں اس کی فکر بھی نہیں ہے۔

دنیوی کوئی چیز ہم خریدتے ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ وہ بہتر سے بہتر ہو۔ گاڑی کا کلر بہترین ہو، ڈیزائن بہترین ہو۔ بیٹھنے اور چلانے کی ساری سہولتیں اس میں مہیا ہوں، کپڑے بہترین ہوں، گھڑی بہترین ہو، چپل اور جوتے بہترین ہوں۔ ہر چیز میں ہم کوالٹی، ڈیکوریشن (Decoration) اور خوبصورتی کو ترجیح دیتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے اعمال کی فکر کیوں نہیں؟

اس لیے آدمی جو بھی عبادت ادا کرے تو اس میں ان ساری چیزوں کا خیال رکھے، اور ان کو بے حیثیت اور ہلکا نہ سمجھے۔

۱: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/ ۱۸۲۔ ۲: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/ ۱۸۳۔

جیسے نماز میں افضل اور بہتر یہ ہے کہ آدمی ناف کے نیچے ہاتھ باندھے، آمین آہستہ کہے، ٹوپی پہن کر نماز پڑھے، لباس صحیح اور اسلامی پہن کر آئے، نگاہ نیچی رکھے، ہر رکن اعتدال سے ادا کرے، تکبیر اولیٰ سے نماز ادا کرے، اور بخوشی اس کو ادا کرے، بوجھ اتارنے کے لئے یا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس کو ادا نہ کرے، وضو میں تمام سنن اور آداب کی رعایت کرے، مسجد کے تمام آداب کی رعایت کرے، اگرچہ ان کے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے، لیکن ان کے کرنے سے نماز میں معیار پیدا ہوتا ہے، حسن پیدا ہوتا ہے، قبولیت کی زیادہ امید ہوتی ہے، اور پھر صرف اتنے ہی آداب اور مستحبات نہیں ہیں، بلکہ سمجھنے کے لئے میں نے چند ذکر کر دیئے ہیں۔ یہ سارے آداب کسی عالم سے رابطہ کر کے سیکھے جا سکتے ہیں، ویسے چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسالے بھی اس موضوع پر ملتے ہیں وہ حاصل کر کے اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ الحمدللہ! اعمال تو ہم کرتے ہیں لیکن اعمال میں ان چیزوں کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس لئے ہمیں اپنے اعمال میں بھی احسان کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر:

نماز کے حسین بنانے پر ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر یاد آیا، فرماتے ہیں:

نماز حسنِ ادا سے حسین ہو اتنی
جو شکل دیں تو وہ جنت کی حور ہو جائے

(کلام غلام۔ یہ حضرت صوفی شاہ غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا منظوم کلام، جو حمد باری، نعت حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم، اور مختلف اصلاحی نظموں کا ایک حسین گلدستہ ہے)

اعمال میں صفتِ احسان نہ ہونے کا اثر:

علماء نے لکھا ہے کہ نماز کو جنت کی حور کی شکل دے کر بدلے میں پیش کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے نماز پڑھی اور درخواست کی کہ یا اللہ!

مجھے اس نماز کا بدلہ دکھادیں، تاکہ میرے شوق میں اوراضافہ ہو جائے۔ کبھی کبھی اللہ پاک بزرگوں کی ایسی بات بھی پوری فرمادیتے ہیں۔ اللہ پاک نے انہیں ان کی نماز ایک حور کی شکل میں دکھائی، انہوں نے دیکھا کہ ایک بہترین حسین و جمیل حور ہے، لیکن اس کے پاس آنکھوں کی بینائی نہیں ہے، انہوں نے اپنے شیخ سے عرض کیا کہ میں نے ایسی دعا کی تھی اور مجھے یہ چیز دکھائی گئی، فرمایا کہ کیا تم نماز آنکھ بند کر کے پڑھتے ہو؟ کہا کہ جی ہاں! فرمایا کہ یہ عمل خلافِ سنت ہے، اس لئے اُس حور کی آنکھ چلی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ حور جنت میں اندھی نہیں رہے گی۔

لیکن اس میں اس جانب اشارہ تھا کہ یہ سنت کے چھوڑ دینے کا اثر ہے، اس میں کوالٹی پیدا نہ کرنے کا یہ اثر ہے۔ ظاہر ہے کہ آنکھ بند کر کے نماز پڑھنے سے نماز ادا ہو جاتی ہے، لیکن مکروہ ہوتی ہے، اس میں معیار اور حسن یہ ہے کہ اس کو کھلی رکھ کر نماز ادا کی جائے، کیونکہ نبی ﷺ آنکھ بند کر کے نماز ادا نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے عمل چاہے جو بھی ہو لیکن اسے عمدگی کے ساتھ، سنن، مستحبات اورآداب کی رعایت کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔

مؤمنین کے لیے مزید دو جنتیں:

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتَانِ ﴿۶۲﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۶۳﴾

ان دونوں (باغوں) سے کم درجہ میں دو باغ اور ہیں، سو (اے جن وانس!) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے؟

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خوفِ خدا رکھنے والے کے لئے اور دو جنتوں کا وعدہ کیا ہے، اور پھر ان دونوں کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں۔

مذکورہ جنتیں کس کے لئے ہوں گی؟

ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کل چار جنتیں ہیں، دو جنتیں مقربین اور سابقین کے لئے ہیں، جس میں پھل اور بہتے ہوئے چشمے ہوں گے، اور دو جنتیں اصحاب الیمین کے لئے ہوں گی، جس میں پھل کھجور، انار اور دو ابلتے ہوئے چشمے ہوں گے۔

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پہلی دو جنتیں مقربین کے لئے ہوں گی، جو دونوں سونے کی ہوں گی، اور دوسری دو جنتیں اصحاب الیمین کے لئے ہوں گی، جو دونوں چاندی کی ہوں گے۔[۱]

پہلی دو جنتیں افضل ہیں یا بعد کی:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی دو جنتیں افضل ہیں یا بعد کی دو جنتیں افضل ہیں؟ بعض حضرات دوسری دو کو افضل قرار دیتے ہیں، اور جمہور علماء کہتے ہیں کہ پہلی دو جنتیں افضل ہیں۔

(۱) کیونکہ پہلی دو جنتوں کے بارے میں مروی ہے کہ وہ سونے کی ہیں اور بعد کی دو جنتیں چاندی کی ہیں۔

(۲) پہلی دو جنتوں میں چشموں کی صفت جاری ہونا مذکور ہے کہ وہ دو چشمے جاری ہوں گے عرش سے، جبکہ دوسری جنتوں میں چشموں کی صفت ابلنا ہے، اور ظاہر ہے کہ بہنا اور وہ بھی عرش کے نیچے سے ابلنے کے مقابلہ میں بہتر ہے۔[۲]

(۳) پہلی جنتوں میں فاکہہ عام ہیں، ہر قسم کے پھل اس میں شامل ہیں، جب کہ دوسری دو جنتوں میں کھجور اور انار ہی کا ذکر ہے، اس میں عمومیت نہیں ہے۔ اس لئے پہلی دو جنتیں ہی افضل ہوں گی۔[۳]

دو دو جنتوں کا ذکر کیوں؟

یہاں اللہ پاک نے جنت کا ذکر صیغۂ تثنیہ سے کیا ہے، ''تثنیہ'' دو کو یعنی ایک سے زیادہ کو بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور عربوں میں اس کی عادت بھی تھی، اسی وجہ

۱: تفسیر قرطبی: ۱۷/ ۱۸۳۔ ۲: حوالۂ سابق۔ ۳: حوالۂ سابق، تفسیرِ مظہری: ۹/ ۱۶۰۔

سے "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ" کہتے ہیں، اس کے اصل معنی "بار بار حاضر ہونے" کے ہیں۔ یہاں "لبیک" جو کہ تثنیہ کا لفظ ہے اس کا مقصد بھی تعدد کو بتانا ہے، کہ صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ ایک سے زیادہ مرتبہ میں آپ کی بات پر حاضری دیتا ہوں، احترام کے پیش نظر اس طرح کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ، دو دو جنتوں کا تعارف فرمارہے ہیں کہ اے بندے! تیرے لئے دو جنتیں ہیں، یا تیرے لئے جنتیں ہی جنتیں ہیں، بس میرے پاس آجا۔

جیسے اگر بچہ نہ پڑھ رہا ہو تو اُس کو یہ کہا جاتا ہے کہ تمہیں سائیکل دلائی جائے گی، لہٰذا پڑھ لو۔ وہ پھر بھی نہیں مانتا ہے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ سائیکل کے ساتھ ساتھ تمہارے لیے ہم ایک اسکوٹر بھی خریدیں گے، اب پڑھ لو۔ اگر وہ اب بھی نہ پڑھے تو آپ اُس سے مزید کسی اور چیز کا وعدہ کرتے ہیں۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا یہ انداز ہے کہ وہ اپنی دی ہوئی نعمتوں کو بھی یاد دلارہے ہیں اور آئندہ جو دی جانے والی ہیں اس کی بھی ترغیب دلارہے ہیں۔ تاکہ بندہ میں سمع واطاعت کا جذبہ پیدا ہو۔ اور ناشکری کا مزاج نکل جائے۔

ایک نکتہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان جنتوں کے ذکر میں آٹھ قسم کی نعمتوں کا بیان فرمایا، اور آٹھ مرتبہ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ ذکر فرمایا۔ جب جہنم کی تفصیلات بیان فرمائیں تو اُس میں سات قسم کے عذابوں کا تذکرہ فرمایا اور سات ہی مرتبہ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ ذکر فرمایا، کیونکہ جہنم کے سات دروازے ہیں اور جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ اس اعتبار سے جنت کی آٹھ نعمتیں بیان فرمائی، اور جہنم کے سات عذاب بیان کئے۔ تاکہ آدمی جنت کے کام کرے اور ان آٹھ نعمتوں کو حاصل کرے، اور منہیات سے بچے اور جہنم کے ان سات عذابوں سے بچے۔ اس طرز سے اس جانب بھی اشارہ ہے کہ: "سَبَقَتْ رَحمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ" کہ اللہ پاک کی رحمت اس کے غصہ پر غالب ہوتی ہے۔ کیونکہ سزا کا ذکر ہے تو سات مرتبہ ہے اور نعمت کا ذکر ہے تو آٹھ مرتبہ ہے۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ کا عملی شکریہ

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ کا عملی شکریہ یہ ہے کہ آدمی سچے دل سے توبہ کرے، اپنی نیت کو سدھارے، نیت ایسی چیز ہے کہ جس کیلئے باضابطہ کوئی وقت نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ یہاں بیٹھے بیٹھے سوچ لیں کہ میں نے گناہوں کو چھوڑ دیا، اور ان گناہوں کو چھوڑنے کیلئے جو تدابیر ہیں اُن کو اختیار کرنا شروع کر دیا، بس توبہ ہو گئی۔

نیت کی تبدیلی کا اثر:

ابھی حضرت ڈاکٹر صاحب (حضرت تنویر احمد صاحب قبلہ نور اللہ مرقدہٗ خلیفہ حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ علیہ) تشریف لائے تھے، وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ بیان کر رہے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: حضرت! ”مجھے کھیت اور باغات کی طرف جاتے ہوئے کافی تکلیف ہو رہی ہے، اس لئے میں وہاں جانے کے لیے ایک گھوڑا لینا چاہتا ہوں۔“ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بعد میں پوچھ لیں، پھر وہ دوسری مرتبہ آئے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پھر انہیں ٹال دیا۔ دو تین دن کے بعد پھر آئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب میں تمہیں دو تین دن سے ٹال رہا ہوں تو خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی بات ہے، بات در اصل یہ ہے کہ آپ کے سوال میں کچھ کسر باقی ہے۔ مولانا شبیر احمد صاحب نے کہا کہ حضرت! میرے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، آپ ہی بتادیں۔ فرمایا کہ جب گھوڑا لینا ہی ہے تو پھر کھیت کے لیے لینے کی کیا ضرورت ہے؟ جہاد کے لیے لے لو، جب گھوڑا گھر پر کھڑا ہو گا تو اُس پر بیٹھ کر اپنے اور کام بھی کر لینا، بس انہوں نے نیت تبدیل کی اور کہا کہ حضرت! میں جہاد کے لیے ایک گھوڑا لینا

چاہتا ہوں۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ واہ واہ! بڑی اچھی بات ہے۔ نیت درست کرلی، اور گھوڑا خرید لیا، بس اب ثواب ہی ثواب ہے۔ اگرچہ گھر کی ضروریات میں استعمال ہو رہا ہے، لیکن ثواب اپنی جگہ برابر مل رہا ہے۔

اگر ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ کا استحضار ہو جائے تو آدمی بیٹھے بیٹھے اپنی دل کی دنیا کو بدل دے۔ نیت کے بدلنے میں کسی قسم کی تکلیف اور دشواری نہیں، اس لئے نیت کی اصلاح فوراً ہی کرلینی چاہئے، چاہے صبح ہونے سے پہلے ہی وہ ٹوٹ جائے، کیونکہ یہ نہیں معلوم ہے کہ وہ ٹوٹے گی یا نہیں ٹوٹے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اُس کو اتنا مضبوط بنادیں گے کہ پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ہو۔ اگر آپ کو ایسا محسوس ہو کہ آپ اس کو باقی نہیں رکھ پائیں گے تو یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ ہم مستقبل کے ذمہ دار نہیں ہیں، اگر وہ پھر بھی ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کرلیں، اگر پھر ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کرلیں، بس ان کو مناتے رہیں۔

یہ رشتہ محبت کا تو قائم ہی رکھے
جو سو بار ٹوٹے تو سو بار جوڑے

دونوں باغ سبز ہوں گے:

مُدْهَامَّتَانِ ﴿۶۴﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۶۵﴾

”وہ دونوں باغ گہرے سبز ہوں گے، سوائے جن وانس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“؟

سبز ہونے سے جو سیاہی جھلکتی ہے اس کو ادہام کہتے ہیں۔ اور یہاں مراد یہی ہے کہ ان دو باغوں میں اتنی بیلیں ہوں گی اور وہ دونوں اتنے گھنے ہوں گے اور ایک دوسرے میں اتنے گتھم گتھا ہوں گے، ایسا لگے گا کہ سارے کے سارے باغ کالے ہیں۔ اگر ان

باغوں میں کہیں کہیں درخت ہوتا، درمیان میں ٹہنیاں اِدھر اُدھر سے نکلی ہوئی ہوتیں، کہیں پتے ہوتے اور کہیں نہ ہوتے تو پھر ان سے وحشت ہونے لگتی۔ ان باغوں کو اللہ پاک نے گھنا ہمارے لئے بنایا ہے۔ ان باغوں کے سایوں کی کس کو ضرورت ہے؟ کیا جبرئیل کو اس کی ضرورت ہے؟ کیا فرشتوں کو اس کی ضرورت ہے؟ یہ باغات تو ہمارے لیے بنائے گئے ہیں اور ہم دنیا کی مختصر اور عارضی زندگی کے مزوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں پر صبر کرو، شریعت کی پابندی کرو، پھر دیکھو کہ وہاں کیا کچھ ملے گا؟

چشموں سے مشک و عنبر اور کافور کی بارش :

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾

اُن دو باغوں میں جوش مارتے ہوئے دو چشمے ہوں گے۔ سوائے جن و انس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

دنیا میں جو بڑے بڑے چشمے ہیں جن میں سے پانی نکلتا ہے، جنہیں دیکھنے کیلئے سارے انسان جمع ہوتے ہیں، لوگوں نے ان کو ایک تفریح گاہ بنایا ہوا ہے، لیکن جنت کے چشمے تو قدرتی چشمے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جیسے دنیا میں پانی کے قطرے گرتے ہیں ویسے ہی اہل جنت پر ان چشموں سے مشک، عنبر اور کافور کی بارش ہوگی۔[1]

جنت کا کھجور:

فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾

''اُن دونوں (باغوں) میں میوے، کھجوریں اور انار ہیں، سوائے جن و انس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''؟

---

[1] تفسیر قرطبی: ۱۸/ ۱۸۵۔

جنت کے کھجور کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس کی لمبائی بارہ ہاتھ کی ہوگی، اور اس کے اندر گٹھلی نہیں ہوگی۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ایک ہی کھجور سے کئی لوگ کھائیں گے۔[1] اور کھجور کے درختوں کے تنے زمرد کے اور پتے سرخ سونے کے ہوں گے، ان کے ریشوں سے اہل جنت کے لباس اور جوڑے بنائے جائیں گے، اور ان کے پھل ڈولوں اور مٹکوں کے برابر ہوں گے، دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھے اور مکھن سے زیادہ نرم ہوں گے، اور ان میں گٹھلی نہیں ہوگی۔[2] جب ایک پھل توڑا جائے گا تو اس کی جگہ فوراً دوسرا آجائے گا۔[3]

جنت کا انار:

ایسے ہی جنت کا انار ہوگا، علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے روح المعانی میں ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جنت میں انار کا ایک درخت دیکھا، اُس کے انار اُس اونٹ کے برابر تھے جو پالان کے ساتھ ہو۔[4] آپ سوچیں گے کہ اتنا بڑا انار کیسے توڑیں گے؟ فرمایا: ﴿قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ﴾[5]

اس کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے۔ وہ خود ہی آپ کے پاس آکر جھک جائے گا۔

اہل جنت کو جب پھل دئے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ اس سے پہلے بھی اس جیسا پھل ہمیں دیا گیا: "وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا "[6]

لیکن وہ لذت میں اور خصوصیات میں دنیا کے پھلوں سے بالکل ممتاز اور منفرد ہوں گے۔

جنت کے پھلوں سے لباس اور حور نکلیں گے:

انہیں پھلوں کے ریشوں سے جنتیوں کا لباس تیار کیا جائے گا، وہ پھل کھائیں گے اور ان پھلوں سے ان کے لئے لباس اور جوڑے نکلیں گے۔[7]

---

[1]: تفسیر مظہری: ۱۶۱/۹۔ [2]: مستدرکِ حاکم: باب تفسیر سورۃ الرحمن، ۳۷۷۶۔ [3]: تفسیر طبری: ۱۸۶/۱۷۔
[4]: روح المعانی: ۱۲۱/۱۴۔ [5]: الحاقۃ: ۲۳۔ [6]: البقرۃ: ۲۵۔ [7]: مستدرکِ حاکم: باب تفسیر سورۃ الرحمن، ۳۷۷۶۔

بعض روایات میں یہ مضمون موجود ہے کہ وہاں پر آدمی پھل توڑے گا اور اُس میں سے حور برآمد ہوگی۔ اس میں کسی قسم کا کوئی استعجاب نہیں ہے، جب دنیا میں اس کی نظیر موجود ہے تو جنت میں اس بارے میں کوئی استبعاد نہیں ہونا چاہئے۔

اس کی نظیر برگد (درخت) کے پھل اور گولر کے پھل ہیں، وہ لال اور انجیر کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر آپ گولر کا پھل لیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ پھل چاروں طرف سے بند ہوگا، جیسے ہی آپ اس کو کھولیں گے تو اس کے اندر سے چھوٹے چھوٹے پتنگے اُڑتے دکھائی دیں گے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں یہ بات رکھی ہے کہ جب آپ پھل توڑتے ہیں تو اُس میں سے پتنگا نکلتا ہے، تو اس میں کیا بعد ہے کہ آدمی جنت کا پھل توڑے اور اس میں سے حور نکلے؟

ان آیات میں اللہ پاک نے جنت کے سونے چاندی سے بنے ہوئے مکانات اور عالیشان محلات، بہترین باغات، بہتی ہوئی نہریں، قسم قسم کے زیورات، صوفے، فرنیچر، پھل، انار اور کھجور وغیرہ کا بیان کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ نعمتیں تو آدمی کو حاصل ہوں لیکن کوئی حسینہ نہ ہو تو اُس جنت کو لے کر وہ کیا کرے گا؟ اس لئے فرمایا:

خوبصورت اور خوب سیرت حوریں:

فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٧١﴾

اور ان باغوں کے مکانات میں خوب صورت اور خوب سیرت عورتیں ہوں گی، سو اے جن وانس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

حسان اور خیرات میں فرق:

"خیرات" اخلاق اور کردار کے اعتبار سے عمدہ ہونے کو کہتے ہیں اور "حِسان" شکل وصورت کے اعتبار سے خوب ہونے کو کہتے ہیں۔[1]

---

[1]: تفسیرِ رازی:۲۹/۳۸۰۔

حق تعالیٰ شانہ فرمارہے ہیں کہ وہ خوب سیرت اور خوبصورت ہوں گی، اخلاق و عادات کی بھی خوب ہوں گی جو کہ روحانی صورت ہے اور حسن و جمال کے اعتبار سے بھی خوب ہوں گی جو ظاہری صورت ہے۔

دنیا کی بیویوں میں الا ماشاء اللہ کچھ ایسی ہوتی ہیں، اگر کسی کو صورت ملی ہوئی ہے تو سیرت میں گڑبڑ ہوتی ہے، اور اگر سیرت اچھی ہے تو پھر شکل وصورت پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ البتہ کچھ بندیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی شکل وصورت کے ساتھ ساتھ سیرت بھی خوب ہوتی ہے۔

سیرت ہی اصلی صورت:

اصل سیرت ہے۔ اگر شکل وصورت کسی وجہ سے کوئی خاص نہ ہو لیکن سیرت ہو تو سیرت ہی اصلی صورت ہے، وہ اصل کشش کی چیز ہے، وہی آدمی کو تسلی دینے والی چیز ہے۔

ایک لطیفہ:

ایک صاحب نے کسی سے پوچھا کہ کیا یہاں کی بیویاں بھی وہاں پر ہمارے ساتھ ہوں گی؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں! ساتھ ہی ہوں گی۔ دوسرے صاحب یہ سن کر کہنے لگے یاالٰہی! یہی زندگی عاجز ہوچکی ہے، یہ وہاں پر بھی پہنچ جائے تو کیا ہوگا؟ لیکن دوستو! جب وہ وہاں پر پہنچے گی تو ان صفات کے ساتھ نہیں پہونچے گی۔ بلکہ عمدہ صفات کے ساتھ پہونچے گی۔

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ”خیرات“ اور ”حِسان“ ہوں گی۔

خوبصورت ہوں گی اور خوب سیرت ہوں گی۔ اور پھر کمال کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے لئے گانا بھی گائیں گی، وہاں پر گانا جائز ہے، شراب حلال ہے، رقص حلال ہے جو چیزیں دنیا میں ممنوع ہیں وہاں ممنوع نہیں ہیں۔

جنت کی نعمتیں ابدی ہیں:

اور وہاں شراب و شباب دائمی ہوں گے، کبھی ختم نہیں ہوں گے، دنیا کے بارے میں کسی نے کہا ہے: ”چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے“

لیکن جنت میں ایسا نہیں ہوگا، تر و تازگی ہمیشہ کے لیے ہوگی، حسن و جمال ہمیشہ کے لیے ہوگا، شباب ہمیشہ کے لیے ہوگا، خوبصورتی ہمیشہ کے لیے ہوگی اور اُس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے گا۔ وہاں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پر حسن کو زوال نہیں ہے، بلکہ ترقی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ویسے ویسے حسن بڑھتا جائے گا۔

جنت کی شاپنگ(shopping):

یہ حسن مرد اور عورت دونوں میں بڑھتا جائے گا۔ وہاں حسن کی شاپنگ (shopping) ہوگی۔ جب وہ بازار حسن میں پہنچیں گے تو وہاں مشک کے ٹیلے ہوں گے، ہر جمعہ جنتی وہاں پہنچیں گے، ایک شمال کی ہوا چلے گی اور ان کے چہروں اور ملبوسات پر پڑے گی تو ان کے حسن و جمال میں اضافہ ہو جائے گا، جب لوٹ کر اپنی حوروں کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گی کہ تمہارا تو حسن و جمال کافی بڑھ گیا ہے، اوران کے حسن میں اضافہ دیدارِ الٰہی کے بعد ہوگا۔[۱] اور پھر وہ حوروں سے کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے حسن میں اضافہ دیکھ رہے ہیں، وہ کہیں گی کہ ہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے حسن میں بھی اضافہ فرمادیا ہے۔[۲]

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بازار میں مردوں اور عورتوں کی شکلیں ہوں گی جو جس شکل کو پسند کرے گا وہ اس میں داخل ہو جائے گا۔[۳]

۱: سنن ترمذی: ابواب صفۃ الجنۃ/باب ما جاء فی سوق الجنۃ۔ ۲: صحیح مسلم: باب ماجاء فی سوق الجنۃ، ۷۲۴۷۔ ۳: سنن ترمذی: ابواب صفۃ الجنۃ/باب ماجاء فی سوق الجنۃ۔

دیدارِ الٰہی کی لذت:

جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رؤیت کے لیے دربار سجائیں گے تو عرش کے نیچے سے مُشک کے نورانی بادل اُٹھیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوگا کہ جنتیوں کو جمع کرو۔ لوگ اپنے اپنے مرتبوں کے اعتبار سے جنت میں بیٹھ جائیں گے۔ اور مُشک کی خوشبو فضاء میں پھیل جائے گی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار ہوگا، یہ دیدار خواص کو ہر روز ہوگا، اور جو افضل درجہ کے ہیں ان کو دو مرتبہ ہوگا۔[1]

اس دیدار میں اتنی لذت ہوگی کہ جنتی جنت کی نعمتوں کو بھول جائیں گے۔

جنت میں مومن عورتوں اور حوروں کا مکالمہ:

ایک حدیث میں ہے کہ حوریں جنت میں یہ کلمات کہیں گی اور یہ گانا گائیں گی:

"نَحنُ الرَّاضِیَاتُ فَلَا نَسخُطُ اَبَدًا وَنَحنُ المُقِیمَاتُ، فَلَا نَظعَنُ اَبَدًا وَنَحنُ الخَالِدَاتُ فَلَا نَمُوتُ اَبَدًا وَنَحنُ النَّاعِمَاتُ فَلَا نَبؤُس اَبَدًا وَنَحنُ خَیرَاتٌ حِسَانٌ حَبِیبَاتٌ لِاَزوَاجٍ کِرَامٍ"[2]

"ہم راضی ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گی، ہم یہیں رہیں گی، کہیں اور سفر کر کے نہیں جائیں گی، ہم ہمیشہ رہنے والی ہیں، کبھی نہیں مریں گی، ہم آرام سے ہوں گی، کبھی تکلیف میں نہیں ہوں گی، ہم خوبصورت اور خوب سیرت ہیں، اور ہمارے شوہروں کو محبوب ہیں۔[3]

شوہر کے لیے یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ اس کی عورت اس سے ناراض نہ ہو۔ ایک ہوتا ہے محبت میں ناراض ہو جانا وہ الگ چیز ہے اور ایک ایسی ناراضگی جس میں نفرت کے غبار اُٹھیں، جس سے آدمی اپنی زندگی میں خلل محسوس کرے، اور ایک دوسرے سے دوری پیدا ہو جائے تو پھر یہ ناراضگی بڑی خطرناک چیز ہے، ایسی عورت کسی کام کی نہیں۔

۱: سنن ترمذی: صفة الجنة: باب ماجاء لادنی اہل الجنة: ۲۷۶۰۔ وباب ماجاء فی سوق الجنة۔ ۲: سنن ترمذی: باب ماجاء فی کلام الحور العین، ۲۷۶۳، وتفسیر قرطبی۔ ۳: سنن ترمذی: باب ماجاء فی کلام الحور العین، ۲۷۶۳۔

مخطوبہ میں صفتِ محبت ملحوظ رکھنی چاہیے:

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ''

محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو۔

آپ ﷺ نے پہلے صفتِ ''وَدُوْدْ'' کو ذکر فرمایا پھر ''وَلُوْدْ'' کو۔ یعنی جب تم نکاح کرو تو خوب محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے کرو۔ اس سے پتہ چلا کہ بیوی میں صفت محبت کا ہونا کتنا اہم ہے؟

پیغامِ نکاح کے وقت خواتین میں محبت پہچاننے کا طریقہ:

اب آپ کہیں گے کہ اس کا اندازہ کیسے ہوگا؟ علماء نے فرمایا کہ اس کا اندازہ اس طرح کیا جائے کہ اس کی ماں کو دیکھا جائے کہ وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے یا نہیں؟ اُس کے بچے زیادہ ہیں یا نہیں؟ اس کے خاندان کی خواتین کو دیکھا جائے کہ ان میں اولاد زیادہ ہوتی ہے یا نہیں؟ اس خاندان کی عورتیں اپنے شوہروں سے محبت کرتی ہیں یا نہیں؟

بہرحال عورت کے اندر اس وصف کا ہونا بہت ضروری ہے، اس کے بغیر زندگی ناقص، ادھوری اور اجیرن ہو جاتی ہے۔ جب حوریں یہ کلمات کہیں گی تو مومن عورتیں ان کا جواب دیں گی۔

دنیا کی عورتوں کا جواب:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دنیا کی عورتیں اس کے جواب میں کہیں گی:

''نَحْنُ الْمُصَلِّيَاتُ وَمَا صَلَّيْتُنَّ وَنَحْنُ الصَّائِمَاتُ وَمَا صُمْتُنَّ وَنَحْنُ الْمُتَوَضِّئَاتُ وَمَا تَوَضَّأْتُنَّ وَنَحْنُ الْمُتَصَدِّقَاتُ وَمَا تَصَدَّقْتُنَّ''[1]

''ہم دنیا میں نماز پڑھتی تھیں، تم نے تو نماز نہیں پڑھی، ہم روزہ رکھتی تھیں تم نے تو کبھی روزہ نہیں رکھا، ہم وضو کرتی تھیں تم نے تو کبھی وضو نہیں کیا، ہم صدقہ کرتی تھیں

---

[1]: تفسیرِ قرطبی: ۱۸۷/۱۷۔

تم نے تو کبھی صدقہ نہیں کیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ خدا کی قسم دنیا کی عورتیں ان پر غالب ہو جائیں گی"۔

حور زیادہ خوبصورت ہو گی یا مومن عورت؟

دنیا کی عورتیں درجوں میں بھی ان سے افضل ہوں گی، اور حسن و جمال میں بھی ان پر فائق ہوں گی، حوروں کی خوبصورتی تو آپ نے سن لی، ان کی صفات بھی آپ نے سن لی، لیکن ان کے حسن کے مقابلہ میں دنیا کی عورتوں کا حسن ہی زیادہ ہو گا۔ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) جنت کی حوریں زیادہ خوبصورت ہوں گی یا مومن عورتیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن عورتیں حوروں سے زیادہ حسین کر دی جائیں گی۔ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کس سبب سے ایسا ہو گا؟ آپ نے فرمایا کہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نماز روزہ اور دیگر عبادتوں کو ادا کیا ہے۔[1]

جنت کی حوروں نے یہ سب کچھ نہیں کیا، لیکن دنیا کی خواتین نے بڑے مجاہدے کئے، بڑے پاپڑ بیلے، اپنے آپ کو پردے میں رکھا، نمازیں پڑھی، روزے رکھے، بچوں کی پرورش کی، ان سب کا صلہ ان کو ملے گا۔ ان ایمان والی عورتوں کو دیا جانے والا حُسن حوروں کے پاس نہیں ہو گا۔ اللہ پاک نے اعمالِ نبوی میں جو حسن اور خوبصورتی رکھی ہے اور جو نور رکھا ہے اس کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر اللہ پاک کسی بھی ایک سنت کے نور کو دنیا والوں پر ظاہر فرما دیں تو دنیا والے اس کو برداشت نہیں کر پائیں گے، وہ آخرت ہی میں ظاہر ہو سکتا ہے، اس حقیر سی دنیا میں اس کا نور بتایا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کسی بھی سنت کو معمولی اور حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ سنت والی زندگی پر فخر کرنا چاہئے۔ اس پر خوش ہونا چاہئے۔

---

[1]: المعجم الکبیر: ۱۹۳۱۳۔

حوروں کی تعریف:

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾

”وہ عورتیں گوری رنگت والی ہوں گی، اور خیموں میں محفوظ ہوں گی، سوائے جن و انس! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

حور کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبِ تفسیرِ مظہری نے لکھا ہے کہ حور اس کو کہتے ہیں جس کا رنگ گورا ہو، آنکھوں کی سفیدی میں سفیدی خوب نمایاں ہو، سیاہی میں سیاہی خوب نمایاں ہو، پلکیں چمک دار ہوں، اُس کے اطراف کے حلقے سفید ہوں، سیاہ نہ ہوں، آنکھیں ہرن کی طرح ہوں۔[۱]

حوریں کس چیز سے پیدا کی گئیں؟

حدیثِ پاک میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ پاک نے انہیں زعفران سے پیدا کیا ہے۔[۲] بعض روایات میں ہے کہ ان کو فرشتوں کی تسبیح سے پیدا کیا گیا ہے۔[۳] بعض روایات میں ہے کہ انہیں مٹی سے نہیں بلکہ زعفران، مشک اور کافور سے پیدا کیا گیا ہے۔[۴]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ انہیں عرش سے نازل ہونے والی رحمت کی بارش سے پیدا کیا گیا۔ اور نہروں کے کنارے ان کے خیمے لگادیئے گئے، جن کی چوڑائی چالیس میل کی ہے۔ اور ان کے دروازے نہیں ہیں۔[۵]

حوروں کا نیک بندوں کی تمنا کرنا:

حدیثوں میں آتا ہے کہ جب ماہِ رمضان شروع ہوتا ہے تو عرش کے نیچے سے ایک ہوا چلتی ہے، جنت کے پتے بجنے لگتے ہیں، جنت کو اور حوروں کو اگلے سال تک کے لئے

۱: تفسیرِ مظہری: ۹/۱۶۲۔ ۲: المعجم الکبیر: ۱۹/۷۷۔ ۳: کنز العمال: ذکر الحور، ۳۹۴۶۴۔ ۴: الزھد لابن المبارک: باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ۷/۱۵۳۔ ۵: تفسیر قرطبی: ۱۷/۱۸۸۔

مزین کر دیا جاتا ہے، یہ منظر دیکھ کر حوریں کہتی ہیں کہ یا اللہ اپنے نیک بندوں میں سے ہمارے شوہر بنا دیجئے تا کہ وہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں اور ہم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں۔ پھر جو لوگ روزے رکھتے ہیں تو اللہ پاک حورِ عین سے ان کا نکاح کر دیتے ہیں۔[۱]

دنیا کی عورتوں کا جھگڑا دیکھ کر حوروں کا کوسنا:

ایک حدیث میں ہے کہ جب اس دنیا میں کسی نیک مؤمن بندے سے اُس کی بیوی جھگڑتی ہے تو آسمان سے حور کہتی ہے کہ اس کو تکلیف مت دے، اللہ تجھ کو ہلاک کرے، وہ تو اب تیرا مہمان ہے، قریب ہے کہ وہ تجھے چھوڑ کر ہمارے پاس آجائے۔[۲]

ایسی پاک دامن خوبصورت، نیک سیرت حوریں ہمارے لئے خیموں میں محفوظ ہیں، ان کی نظر سے مخلوقات اور وہ مخلوقات کی نظر سے چھپی ہوئی ہیں۔ وہ خیمے کیسے ہیں؟ تو اس کے بارے میں احادیث میں مروی ہے:

جنت کے خیمے:

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں ایک خیمہ ہو گا، جس کی چوڑائی ساٹھ میل ہے، اس کے ایک گوشہ میں رہنے والے دوسرے گوشہ والوں کو دیکھ نہیں پائیں گے۔ اہل جنت اس کا دورہ کریں گے۔[۳]

ایک اور روایت میں ہے کہ خیمہ ایک کھوکھلے موتی کا ہو گا، ایک فرسخ چوڑا ایک فرسخ لمبا ہو گا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ وہ چار فرسخ کا ہو گا، اور اُس میں چار ہزار سونے کے دروازے ہوں گے۔[۴] اور بعض روایات میں ہے کہ ایک ہی موتی کا خیمہ ہو گا جس میں موتی کے ستر دروازے ہوں گے۔[۵]

بہر حال وہ حوریں ان خیموں میں محفوظ ہوں گی۔

---

[۱]: کنز العمال: کتاب الصوم: ۱۱/۲۳/۱۲/۱۳۔ [۲]: سنن الترمذی: باب الرضاع: ۱۲۰۷۔

[۳]: تفسیرِ مظہری: ۹/۱۶۲۔ [۴]: روح المعانی: ۱۴/۱۲۲۔ [۵]: حوالۂ سابق۔

حوروں کی آنکھیں اور نفوس غیروں کے خیال سے پاک ہوں گے:

علماء نے اس کا ایک مطلب یہ لکھا ہے کہ اُن کے دل اور اُن کے نفوس سوائے اپنے شوہر کے کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے۔

صرف اپنے شوہر ہی کے بارے میں ان کا خیال اور دل معلق ہو گا، اور ان کی آنکھیں صرف ان کے ہی شوہروں کو دیکھیں گی۔[۱]

ایک حدیث میں ہے کہ: جب جنتی اپنی جنت میں جائے گا اور اپنے خیمے کے پاس پہونچے گا تو اچانک خیمے میں سے ایک دروازہ کھلے گا، اور وہ وہاں اپنی حور بیٹھی ہوئی دیکھے گا، تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی حور پر ملائکہ اور جنت کے خادموں میں سے کسی کی نظر نہیں پڑی ہے۔[۲]

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے خیموں میں بالکل بند اور محفوظ ہوں گی وہاں سے کوئی اور جگہ وہ نہیں جائیں گی۔[۳]

نیز اس میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ جنتی کسی ضرورت کے لئے کسی جگہ نہیں جائے گا، بلکہ وہ چیز اس کے پاس آجائے گی، ماکولات اور مشروبات اس کے پاس آجائیں گے، کسی حور سے ملنے کی خواہش ہو گی تو خیمہ ان کو لے کر مومنین کے پاس آجائے گا۔[۴]

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۷۵﴾

”(اور) ان (جنتی) لوگوں سے پہلے ان پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہو گا اور نہ کسی جن نے۔ سو (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“؟

وہ اپنی ذات سے بھی عفیفہ ہوں گی اور دوسروں سے بھی اللہ پاک نے اُن کو محفوظ رکھا ہو گا۔

۱: روح المعانی: ۱۴/ ۱۲۲ و تفسیر رازی: ۲۹/ ۳۷۹۔ ۲: تفسیر قرطبی: ۱۷/ ۱۸۸۔

۳: تفسیرِ مظہری: ۹/ ۱۶۲۔ ۴: تفسیر رازی: ۲۹/ ۳۸۴۔

مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾

''وہ لوگ سبز مشجّر اور عجیب خوبصورت کپڑوں (کے فرشوں) پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ سو (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟''

رفرف کیا ہے؟

''رَفْرَفٍ'' کے معنیٰ سبز کپڑے کے ہیں جس سے بستر، فرش، تکیے اور گدے بنائے جاتے ہیں، ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس سے بیٹھنے کی جگہیں مراد ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ جنت کے سبز باغ مراد ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ کہنی ٹیکنے کے تکیے مراد ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ بستر کے زائد حصے یعنی جھالر وغیرہ مراد ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ بچھونے مراد ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ قالینیں اور مسندیں مراد ہیں۔[۱]

علّامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ضعیف حدیث کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رفرف ایک ایسی چیز ہے جو آدمی کو لے کر اڑے گی، جیسے واقعہ معراج کے بارے میں ایک روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سدرۃ المنتہیٰ پر پہونچے تو رفرف آیا اور جبرئیل علیہ السلام سے لے کر آپ کو اللہ پاک کے سامنے لے گیا، پھر جب واپسی کا وقت ہوا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پاس پہنچادیا۔ پس یہ رفرف جنت کے خادموں میں سے ایک خادم ہے، جیسے انبیاء براق پر سوار ہوتے تھے اسی طرح اہل جنت اس پر سوار ہوں گے۔ وہ ان کا فرش ہو گا۔ اور وہ اس پر ٹیک لگا کر بیٹھیں گے، اور وہ ان کو نہروں کے پاس، بیویوں کے پاس اور جہاں وہ چاہیں گے لے جائے گا۔[۲]

۱: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/۱۹۰ و مظہری: ۹/۱۶۳۔ ۲: تفسیر قرطبی: ۱۷/۱۹۱۔

عبقری کی وضاحت:

"عَبۡقَرِيٍّ" کے معنیٰ نہایت عمدہ، کامل، عجیب اور نادر کے ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مسندیں یا بہترین منقش کپڑے مراد ہیں۔

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ "عبقر" اُس جگہ منسوب ہے جہاں جنات زیادہ ہوتے تھے، اور وہاں کے کپڑے نہایت ہی عمدہ اور حسین ہوتے تھے۔[۱]

مطلب یہ ہے کہ اہل جنت نہایت ہی حسین، نقش و نگار کئے ہوئے، بیل بوٹوں سے سجے ہوئے اور شجر کاری کئے ہوئے تکیوں، صوفوں اور قالینوں پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔

جنتی تکیہ لگائے بے فکر بیٹھے رہیں گے:

علّامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھاہے کہ دنیامیں آدمی دن بھر محنت کرتا ہے، مشقت کرتا ہے، تھکن سے چور ہو کر رات میں سکون اور راحت حاصل کرنے کے لئے بیوی کے پاس جاتا ہے، پھر صبح اٹھ کر محنت اور مشقت کے لئے نکل جاتا ہے، دنیامیں یہ محنت، مشقت اور تھکن کا نظام ہے، لیکن جنت میں ایسا نہیں ہو گا، جنت میں آدمی کو نہ پہلے محنت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ بعد میں۔ صرف تکیہ لگا کر آرام اور سکون سے بیٹھا رہے گا۔[۲]

تکیہ لگانا دراصل بے فکری سے کنایہ ہے، مطلب یہ ہے کہ وہاں آدمی بے فکر ہی ہو گا، کسی قسم کا کوئی بوجھ نہیں ہو گا، کوئی ٹینشن نہیں ہو گا، بس راحت ہی راحت اور عیش ہی عیش ہو گا۔

برکت کے معنیٰ:

تَبٰرَكَ اسۡمُ رَبِّكَ ذِي الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ ﴿۷۸﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الۡعَظِيۡمُ

"بڑا بابرکت نام ہے آپ کے رب کا جو عظمت والا اور احسان والا ہے"۔

۱: حوالہ سابق۔ ۲: تفسیر رازی: ۲۹/ ۳۸۴۔

علماء نے لکھا ہے کہ اسم سے مراد اللہ پاک کی صفت ہے، اس میں اللہ پاک اپنے نام کا اثر بتانا چاہتے ہیں۔[۱] اُن کی ذات کا تو کیا کہنا اُن کا نام بھی بڑی برکت والا ہے۔
"برکت" کے معنیٰ ثبات اور دوام، رفعت اور بلندی کے ہیں۔ اگر "برکت" کے معنیٰ دوام کے لیں تو معنیٰ ظاہر ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس کا نام ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اسی وجہ سے جنتی جنت میں بھی اللہ پاک کا ذکر کرتے رہیں گے۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ برکت خیر اور اچھی چیزوں میں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا نام خیر ہی خیر ہے، اس سے نعمتیں اور برکتیں حاصل ہوتی رہیں گی، شر دور ہوتا رہے گا، شیطان بھاگتا رہے گا، اللہ پاک کا قرب حاصل ہوتا رہے گا۔
اور پھر چونکہ اس کے معنیٰ رفعت اور بلندی کے بھی ہیں اس لئے اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا نام ہمیشہ بلند رہے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔[۲]

افتتاح رحمٰن سے تو اختتام اکرام سے:

اللہ پاک نے اس سورت کا آغاز صفتِ رحمٰن سے کیا اور اس کا اختتام صفتِ اکرام سے کیا۔ اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ انسانوں کی پیدائش، آسمان اور زمین کی پیدائش، چاند اور سورج کی پیدائش، جنت اور جہنم کی پیدائش، اور سارے انعامات اور احسانات سب اس کے رحم و کرم کی وجہ سے ہیں۔[۳] (یا پھر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ پاک نے صفت رحمٰن کی تجلی سے ہمیں وجود بخشا، قرآن کی تعلیم دی، ساری کائنات کو ہمارے لئے مسخر کیا، اگر انسان اس کا صحیح استعمال کرے اور اپنی زندگی اس کی مرضی کے مطابق گزارے اور اس کی نافرمانی سے بچے تو حق تعالیٰ اس پر صفت اکرام کی تجلی فرمائیں گے، جس سے اسے دونوں جہاں میں عزت بھی ملے گی، گویا رحمٰن سے دنیوی نعمتوں اور اکرام سے اخروی نعمتوں کی طرف اشارہ کیا۔ (مرتب: عطاء الرحمن)

۱: تفسیر مظہری: ۹/ ۱۶۴۔ ۲: تفسیرِ رازی: ۲۹/ ۳۸۶۔ ۳: تفسیرِ قرطبی: ۱۷/ ۱۹۳۔

ایک نکتہ:

اللہ پاک نے پہلے رکوع میں دنیوی نعمتیں ذکر کرنے بعد فرمایا:

﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

کہ تیرے رب کی ذات باقی رہے گی جو عظمت والا اور احسان والا ہے، وہاں اس جانب اشارہ تھا کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر نعمت فنا ہو جائے گی سوائے حق تعالیٰ کی ذات کے کہ وہی باقی رہنے والی ہے۔ اور یہاں اخروی نعمتوں کے ذکر کرنے کے بعد فرما رہے ہیں: ﴿تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ "بڑا بابرکت نام ہے آپ کے رب کا جو عظمت والا اور احسان والا ہے" اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس دنیا سے فنا ہونے کے بعد آخرت میں اہل جنت کی بقا اللہ پاک کے اسم کے ذریعہ ہو گی، اور اہلِ جنت حق تعالیٰ کی نعمتوں سے ذکر الٰہی کے ذریعہ فیض یاب ہوں گے۔[1]

اصل لذت اسمِ الٰہی میں ہے:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور بات بیان فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے جنت کی دوسری نعمتوں اور لذتوں کو تو پہلے بیان کیا ہے، لیکن جو اصل لذت ہے وہ اللہ پاک کے ذکر میں ہے، اس لئے اس کو اخیر میں بیان کر رہے ہیں۔[2]

جس آدمی کو اس کے نام کی حلاوت لگ جاتی ہے تو پھر وہ حور و قصور کی حلاوت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کے نام میں اتنی لذت ہے، اتنا ذائقہ ہے، اتنا مزہ ہے کہ آدمی اس کے علاوہ ہر چیز سے غافل ہو جائے۔

اگر کسی بادشاہ کو اس کی حلاوت کی جھلک دکھلا دی جائے تو وہ ساتوں برِ اعظم پر حکومت کے بجائے اس مزے کو ترجیح دے۔

---

[1]: تفسیرِ رازی: ۳۸۶/۲۹۔ [2]: حوالۂ سابق۔

اللہ کے نام کی حلاوت:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے) کے ساتھ ایک بزرگ شاہ توکل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا۔ وہ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، مجلس کے دوران انہوں نے فرمایا کہ جب اللہ کا نام لیتا ہوں تو میرے منہ میں مٹھائی بھر جاتی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ کوئی تعبیر نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب اللہ کا نام لیتا ہوں تو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کے نام میں بڑی برکت ہے اور اُن کے نام میں بڑی حلاوت ہے، اگر وہ لذت کسی کو مل جائے تو میرے دوستو! اُس کے سامنے یہ دنیا کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار کے نام کی برکت کو جانو اور اُس کو حاصل کرو۔ گویا اس میں اللہ پاک نے ذکر کی بھی ترغیب دی ہے۔ اسی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لَایَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِّنْ ذِکْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی“[1]

مسلسل تمہاری زبان اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر سے تر رہنی چاہئے۔

اہلِ جنت کے لئے کلمۂ توحید ٹھنڈے پانی کی طرح ہے:

اہل جنت کے لئے کلمۂ توحید دنیا میں ٹھنڈے پانی کی طرح لذیذ ہو گا، جیسے دنیا میں آدمی کو ٹھنڈا پانی پینے میں مزہ آتا ہے، اور اس کو راحت اور سکون ملتا ہے، اسی طرح جنتی کے لئے کلمۂ توحید ہو گا۔[2]

جنت میں بھی ذکر اللہ سانس کی طرح جاری رہے گا:

دنیا تو دنیا، آدمی جنت میں جانے کے بعد بھی اللہ پاک کا ذکر کرے گا۔ ایک روایت

---

[1]: سنن الترمذی: باب ماجاء فی فضل الذکر: ۳۳۰۲۔ [2]: شرح حدیث لبیک لابن رجب الحنبلی: ۱/۱۷۔

میں ہے کہ جنتی صبح اور شام اللہ پاک کی تسبیح، تکبیر اور تحمید کریں گے۔[1] علماء نے لکھا ہے کہ جیسے سانس آدمی کو مسلسل جاری رہتی ہے ایسے ہی ذکر اللہ بھی جاری رہے گا۔[2]

اہل جنت کی تحمید اور تسبیح کی وجہ:

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جنتی اللہ پاک کی تسبیح اور تکبیر اس لئے کریں گے کہ وہاں جانے کے بعد ان کے دل اور ان کے نفوس اللہ پاک کی معرفت سے منور ہو جائیں گے، (اور ذکر اللہ کے بغیر انہیں چین نہ آئے گا)۔ جیسا کہ ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”مَنْ أَحَبَّ شَيْئًا أَكْثَرَ مِنْ ذِكْرِهٖ“[3] کہ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تو اس کا ذکر بھی کثرت سے کرتا ہے، اس لئے جب ان کے دل اور ان کے نفوس اللہ پاک کی معرفت سے منور ہو جائیں گے تو وہ وہاں اللہ پاک کی تسبیح، تحمید اور تکبیر بیان کریں گے۔[4]

ذکر اللہ آفتِ زبان سے حفاظت کا سبب ہے:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تک آدمی ذکر میں لگا رہتا ہے تو آفاتِ زبان سے محفوظ رہتا ہے، اُس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ جیسے جب کوئی چیز سرکہ میں ڈال کر رکھتے ہیں تو وہ چیز خراب نہیں ہوتی۔ اسی طرح زبان بھی جب ذکر اللہ سے تر رہتی ہے تو آدمی بھی آفتِ لسان سے محفوظ رہتا ہے۔

ذکر روح کی تقویت کا ذریعہ ہے:

ذکر سے دل میں نورانیت اور صفائی آتی ہے۔ اور روح کو تقویت اور غذا پہونچتی ہے، اور روح میں جتنی تقویت آتی ہے اتنا ہی اللہ پاک کے ذکر میں مزہ آتا ہے۔

۱: صحیح البخاری: باب ماجاء فی صفة الجنة، ۳۲۴۶، و صحیح المسلم: باب ماجاء فی صفات الجنة، ۷۳۳۱۔ ۲: شرح السنة للبغوی: باب صفة الجنة، تحت رقم حدیث ۴۳۷۵۔ ۳: کنز العمال: الباب الأول: فی الذکر وفضیلته، ۱۸۲۹۔ ۴: عمدة القاری: باب ماجاء فی صفة الجنة، تحت رقم حدیث ۵۴۲۳۔

ذکر کا ناغہ روح کا فاقہ:

اسی لئے ایک بزرگ نے فرمایا کہ ذکر کا ناغہ روح کا فاقہ ہے۔ اگر ذکر میں ناغہ ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ روح کا فاقہ ہے، کیونکہ ذکر روح کی غذا ہے۔ اس لئے جس دن ذکر میں ناغہ ہو جائے اور روح کو غذا نہ دے سکو تو پھر نفس کو بھی غذا نہ دو، نفس پریشان ہو جائے گا کہ یہ کیا مصیبت ہے؟ چند دن ہی میں نفس سدھر جائے گا۔ تو جیسے نفس کو غذا نہ دینے سے وہ ناراض ہوتا ہے ایسے ہی روح کو غذا نہ دینے سے وہ ناراض ہوتی ہے۔

روح کی غذا اور دوا:

اصل بات یہ ہے کہ آدمی سے جب معصیت ہوتی ہے تو اُس سے ذکر میں سستی ہوتی ہے۔ ذکر کی کثرت سے آدمی کو طاعت میں ہمت ملتی ہے۔ بزرگوں نے فرمایا کہ اگر معصیت کی وجہ سے ذکر میں ناغہ ہونے لگے اور وحشت ہونے لگے تو اس کا علاج یہی ہے کہ ذکر میں ناغہ نہ کرے بلکہ مجاہدہ کرکے ذکر کرے، کیونکہ یہ غفلت ذکر ہی سے زائل ہوتی ہے، ذکر اس کی دوا ہے۔ اس لئے کثرت سے ذکر کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی واسطے حضراتِ صوفیاء کے پاس ذکر ہی کے ذریعہ روح کی صفائی کی جاتی ہے، خاص طریقوں سے آدمی سے ذکر کروایا جاتا ہے، تب کہیں جاکر روح میں نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی ذکر اس روح کی غذا بن جاتا ہے، بلکہ بعض دفعہ تو جسم کی بھی غذا بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض بزرگ کہتے تھے کہ الحمد للہ اللہ کے ذکر کی برکت سے اب ہمیں کھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ صرف اتباعِ سنت کی نیت سے کچھ کھالیتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے زمانے میں مومنین کی غذا:

ایک حدیث میں آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ قربِ قیامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک وقت ایسا آئے گا کہ آسمان سے بارش بند ہو جائے گی، اور زمین اپنے غلوں کو اگانا بند کر دے گی، اور کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو جائیں گی، صحابہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! وہ اس زمانے میں زندہ کیسے رہیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ

"لا اله الا الله، سبحان الله، الحمدلله اور الله اکبر" پڑھیں گے، اور اُن کے پیٹ بھر جائیں گے۔ ان کو کھانے کے بجائے ذکر اللہ کافی ہو جائے گا۔[1]

اس مادّی دنیامیں اللہ تعالیٰ کا نام لینے میں اتنا مزہ ہے تو پھر آخرت میں کتنا مزہ آئے گا؟

ذکر کی صورتیں:

یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ زبان سے اللہ اللہ کرنے کے علاوہ اس کی اور بھی چند صورتیں ہیں۔ (۱) مراقبہ کیا جائے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بارے میں غور وفکر کیا جائے۔ جس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ (۲) ہر قول اور ہر عمل شریعت کے مطابق کیا جائے، یہ بھی ذکر میں داخل ہے، اور اس کو ذکر حقیقی کہتے ہیں (۳) زبان کے ذریعہ ذکر کیا جائے۔ یعنی اس کی تسبیح، تقدیس، تکبیر اور تحمید بیان کی جائے۔ یہ سب صورتیں ذکر میں داخل ہیں۔

اس لئے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اپنی زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھنا چاہئے، اس کے نام کی بڑی برکت ہے، اس کے اثرات دنیا میں بھی رونما ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی، اس لئے فرمایا:

﴿تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

"بڑا بابرکت نام ہے آپ کے رب کا جو عظمت والا اور احسان والا ہے"

اللہ پاک ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم سب کی خطاؤں کو معاف فرمائے، ہمارے دلوں میں اپنی محبت پیدا فرمائے، اپنی معرفت ہمیں عطا فرمائے اور جو نعمتیں اس سورت میں بیان کی گئیں ہیں اُن سب سے ہمیں سرفراز فرمائے۔ (آمین)

وَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ـ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ـ

---

[1] سنن ابن ماجہ: باب فتنۃ الدجال وخروج عیسیٰ، ۴۰۶۷۔